ماتم سروش
تاریخ
آشوب عشق پیہم
۱۳۴۹ھ
اے روزگار حیف ہے اے روزگار حیف
اے آسماں دریغ ہے اے آسماں دریغ
سرگذشت
ابو النصر فتح اللہ سروش بی۔ اے ایچ۔ سی۔ ایس مرحوم
معہ
کلام سروش
مرتبہ
سارہ بیگم معلمہ محبوبیہ گرلس اسکول

فہرست مضامین آتشِ خموش

اے غائب از نظر بخدا می سپارمت
جانم بسوختی و بجان دوست دارمت

ابوالنصر فتح اللہ ایچ۔ سی۔ ایس۔ مرحوم
(اپریل سنہ ۱۹۲۹ء)

تاریخ طبع کتاب

از صفوۃ الرحمٰن صابر

خواہر محترم نے ہے لکھی — سرگذشت آہ اپنے بھائی کی
ہے یہ تصویر کیفیات غم — یا کہ کہیئے اسے بیاض الم
یا ہیں یہ قطرہائے خون جگر — مظہر حالت دل مضطر
ماجرا اپنی بدنصیبی کا — یا بیاں ہے شکستہ حالی کا
ہستیٔ نامراد کا قصہ — دل صد چاک کا ہے یا نقشہ
گریۂ مرگ نوجوانی ہے — پیارے بھائی کی نوحہ خوانی ہے
ذکر ہے خون صد تمنا کا — حسرت و یاس کا ہے افسانہ
درد انگیز داستاں ہے یہ — کسقدر پر اثر بیاں ہے یہ

تیز پھر آتش نہانی ہے
ہائے پھر آج خونفشانی ہے

---

۱۳ ف ۳۹

دیباچہ

اِک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم چُپ کے چُپ کے روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

مسلمہ امر ہے کہ رات کے وقت ہر درد کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ خواہ امراض جسمانی ہوں یا آلام روحانی آہ! ابوالنصر فتح اللہ کے حادثۂ جانگزا کے بعد دن کا وقت تو مدرسہ کی مشغولیت۔ تعزیت گزاروں کی ملاقات اور افسانۂ مرگ کے بیان میں کسی نہ کسی طرح گزر جاتا لیکن رات جاڑوں کی پہاڑ رات کاٹے نہ کٹتی۔ بستر پر لیٹی اور ایک نہ ایک سماں آنکھوں کے آگے بندھ گیا کسی وقت اس کے بچپن کی دلفریب ادائیں دل کو مسلے ڈالتیں تو کبھی اس کے شباب کی پرلطف بہاریں خون کے آنسو رلاتیں اسکے علاوہ اس کی تعلیمی جدوجہد کلیجہ چھلنی کر دیتی تو اس کی خوش خصالی الگ سینہ میں آگ لگا دیتی۔ چوبیس برس کی زندگی کا ایک ایک منظر میرے پیش نظر ہوتا اور دل مرغ نیم بسمل کیطرح پھڑکتا۔ بعض وقت ایسی وحشت طاری ہو جاتی کہ بس یہ جی چاہتا کہ کپڑے پھاڑ کر گھر سے باہر نکل جاؤں یا دیواروں سے ٹکریں مار کر اپنا سر پاش پاش کر ڈالوں۔

میری یہ حالت دیکھکر تمام بھائی بہنوں خصوصاً رابعہ بیگم اور بہن نورالنساء بیگم نے اصرار کیا کہ میں ان پراگندہ خیالات اور جذبات کو مربوط کرکے بطور ایک لائف کے ترتیب دوں تاکہ اس کی نیک زندگی اور بے وقت موت کی ایک یادگار رہجائے اور ممکن ہے کہ اس شغل میں مجھے بھی کچھ تسکین حاصل ہو۔ چنانچہ تعطیلات کرسمس ہی میں نے لکھنا شروع کیا۔

یہ نہ کوئی لائف ہے نہ سوانحعمری۔ یہ ایک جلے ہوئے دل کا دھواں ہے جس نے الفاظ کا پیکر اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایک مرثیہ ہے جو نثر کی صورت میں ہے خیال تھا کہ شاید دل بیتاب و ناتواں ذرا تسلی پائے۔ ہائے!

تپش کو دل کی میں سمجھا تھا یہ آنسو بجھا دینگے مگر یہ آگ تو پانی سے بھڑکی اور بھی دو نی

دنیا ایک سرائے فانی ہے ایک آتا ہے ایک جاتا ہے جو پیدا ہوا وہ ایک دن ضرور ناپید ہوگا۔ یہاں ہر ہستی کے لئے فنا ہے مگر ابوالنصر کی زندگی اور موت مجموعہ نادرات ہے ایسی ہستیاں بار بار وجود میں نہیں آتیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں ایک فرد کامل نکلتا ہے اس کے تعلیمی کارناموں کے ساتھ اس کی ہوم لائف پر نظر ڈالو تو دل پر ایک عالم گزر جاتا ہے۔ تعلیم تو اکثر افراد اس کے برابر بلکہ اس سے زیادہ پاتے اور ولایت کی اعلیٰ اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں لیکن ایسی مثال کم سے کم میری نظر سے تو اب تک نہیں گزری کہ ایک طالب علم ہر قسم کے موانعات کے باوجود سات سال کی عمر سے لیکر آخر تک بغیر ایکسال ضائع کئے ہوئے ہر امتحان میں اول رہے۔ آہ! یہ اسی جانباز کا حصہ تھا۔ پھر اس کی خوش صفاتی جوانا مرگی اچانک موت۔ اور آہ کس وقت۔ جبکہ تمام مراحل طے کرکے مقصد کے زینہ پر پہلا قدم رکھا تھا۔ دل میں اک آگ لگا دیتی ہے۔ مرنیوالے سب ہی مرتے ہیں مگر مرنے مرنے میں فرق ہے ایک مرنا یہ ہے کہ متعلقین کو صرف اپنے ایک

عزیز کی دائمی مفارقت کا صدمہ پہنچے۔ اور ایک یہ مرنا ہے کہ جس سے گھرانا تباہ اور خاندان برباد ہو جائے۔

میں اماجان کے انتقال کے بعد کہا کرتی تھی۔ کہ نانا ابا کے ساتھ ہمارے گھر کی دینی برکت اٹھ گئی۔ ابا جان کیساتھ علم کا خزانہ مدفون ہو گیا۔ اماجان کے ساتھ خوشی خاک میں ملگئی۔ ہائے صاحب! صاحب!! تو تو اپنے ساتھ سب کچھ لے گیا تیرے ساتھ آرام و سکون گیا۔ اعزاز و افتخار رخصت ہو گیا بس اب ہمارے خاندان کی ترقی مسدود ہو گئی۔

تیرے مرنے سے مرگئی امید

ہائے سمجھ میں نہیں آتا کہ حرماں نصیبی کو روؤں یا اپنی محروم القسمتی پر آنسو بہاؤں نہ زبان میں اتنی طاقت گویائی ہے نہ قلم میں اسقدر قوت تحریر کہ جو آگ دل میں لگی ہوئی ہے اس کو الفاظ میں بیان کروں۔

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور

دیباچۂ ثانی

تعطیلات کرسمس میں اس سرگذشت کا صرف مسودہ لکھنے پائی تھی (کیونکہ درمیان میں میری طبیعت کئی مرتبہ خراب ہوئی) کہ تعطیل ختم ہو گئی اور نظرثانی کا تک موقع نہ ملا میں نے خیال کیا کہ جمعہ اور اتوار کی تعطیل میں مسودہ صاف کردوں لیکن صرف دو دن لکھا تھا جو نہایت شدت سے اختلاج قلب شروع ہو گیا۔ پھر اس کے دورے متواتر ہونے لگے اور یہ کیفیت ہو گئی کہ لکھنا تو درکنار اپنا لکھا ہوا مضمون دیکھنے کی تک دل میں تاب نہ تھی۔

میری ناسازی طبع کے علاوہ گھر میں یکے بعد دیگرے ایسی مصروفتیں (میری بہن طاہرہ بیگم اور بھائی ابوالفتح نصراللہ کی کتخدائی) بھی پیدا ہو گئیں کہ دماغ کو سکون نصیب نہ ہو سکا۔

آخر تعطیلات گرما میں نظر ثانی کر کے مسودہ صاف کیا۔ فٹ نوٹس لکھے۔ گو اس وقت بھی یہ حالت تھی کہ چار سطر لکھتی تو دو گھنٹے دل و دماغ میں بے کیفی اور آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا معلوم ہوتا ہے

ایسا آساں نہیں لہو رونا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

بہر حال جس طرح بھی ممکن ہوا رو رو کے مر مر کے یہ سرگذشت موسوم بہ "خون کے آنسو" مکمل کر لی۔

ابو النصر کی رحلت جانگداز پر دیگر اعزا اور احباب نے بھی اسی زمانہ میں دردناک مرثیے۔ الم انگیز نظمیں لکھی تھیں۔

چھوٹے بھائی ابو ظفر عون اللہ نے اپنی تعطیل سرما اس کام میں صرف کی کہ پیارے بھائی کا کلام جو متفرق کاپیوں اور پرچوں میں پراگندہ تھا جمع کر کے مرتب کیا۔ چنانچہ یہ مجموعہ ایک کتاب کی صورت میں شایع کیا جاتا ہے اس کا نام ابو النصر کے تخلص کی رعایت سے رابعہ بیگم نے "ماتم سروش" تجویز کیا اور میرے خالہ زاد بھائی صفوۃ الرحمن صاحب نے تاریخی نام "آشوب غم" نکالا ہے۔

ماتم سروش اب سے بہت پیشتر طبع ہو چکی ہوتی لیکن میری غیر منقطع علالت باعث تاخیر ہوئی۔

میں اپنی مہربان اور محسن بہن نورالنسا بیگم صاحبہ بی۔ اے کی بہ دل ممنون ہوں کہ صاحبہ موصوفہ نے کتاب ہذا کی طباعت کا انتظام بالکلیہ اپنے ذمہ لیکر مجھے بہت بڑی مدد پہنچائی۔

ماتم سروش کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین میرے عزیز القدر سرمایۂ امید مرحوم و مغفور (آہ اب تک دل گوارا نہیں کرتا کہ اسے مرحوم لکھوں) بھائی کی یوم لائف سے واقف ہو کر اس کے لئے دعائے

مغفرت فرمائیں ۔

یارب اندر چمن خلد گزارش بادا — قصر فردوس برین جائے قرارش بادا

در گلستان جناں چوں گزرد جلوه کناں — حور و غلماں ز یمین و ز یسارش بادا

در شب تار چو عزم سفر عقبیٰ کرد — نور اسلام چراغ شب تارش بادا

بر مزارش چو کسے نیست که افروزد شمع — پرتو لطف خدا شمع مزارش بادا

از عروس چمن دہر چو بگرفت کنار — نو عروسان بہشتی بکنارش بادا

ہیچ یارے چو نشد ہمدم او بعد از مرگ — دمبدم رحمت حق ہمدم و یارش بادا

مردماں قطرۂ اشکے که فشاندند برو — گردد آں قطرہ دُرِ ناب نثارش بادا

تا ابد مسکن او روضهٔ علیین باد

این دعا از من و از روح امین آمین باد

دل ریش و سینه فگار

سارہ

۱۰ر جون سنہ ۱۹۳۰ء

خون کے آنسو

یارب ایں روز چہ روزیست کہ افتاد مرا ۔۔۔ ایں چہ جانکاہ بلائیست کہ رو داد مرا

بادۂ شادی امید دلم رفت بخاک ۔۔۔ بعد ازیں دل بچہ امید شود شاد مرا

میرے پیارے ہر دلعزیز جامع الصفات چراغ خاندان بھائی ابوالنصر فتح اللہ کی جوانمرگی اور مرگ ناگہانی سے جو صدمہ اہل خاندان کو پہنچا ہے اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ ایک آہ کرکے اسکے ساتھ ٹھنڈے ہو جاتے ۔ مگر عبرت عبرت[1] ! ع

رہین سخت جانی ہے حیات جاوداں میری

اسی سال کی ضعیف العمر نانی اور دائم المریض بڑی بہن جو چار برس سے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو چکی تھی رہیں اور وہ جوان جہاں امیدوں کا مرکز بام ترقی پر جلوہ نما ہو کر یوں دفعۃً ہمیشہ کیلئے نظروں سے اوجھل ہو جائے ۔

سب چاہیں جسکی زیست وہ جانِ جہان مرے

قدرت خدا کی پھر جئیں نوجوان مرے

دو سال پیشتر میری حالت اس قدر ردی[2] ہو گئی تھی کہ رات کو سونے کیلئے

---

[1] خداوندا ! تیری حکمت سمجھ میں نہیں آتی ۔ کہ تونے کس حساب سے عمروں کے پیمانے مقرر کئے ہیں ۔ آدھ موئے لگے جو بوڑھوں کو بیماروں کے عوض تندرست کو بیکاروں کے بجائے کارآمد ہستیوں کو فنا کر دیتا ہے ۔ ایک دل جلا کیا کہہ گیا ہے

آپ تجاہل آپ ہی خیال کی کر چھوڑے ۔ پیچھے کی قدر نہ جانے جن جن کلیاں توڑے

[2] ضعف معدہ کی شکایت رفتہ رفتہ اس حد پر پہنچ گئی تھی کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں یا دھیرہ وجہ بشکل ہضم ہوتا سا تھ ہی بوجہ نقاہت اختلاج قلب کے سخت دورے ہوتے تھے ۔

لیٹتی تو امید نہ رہتی کہ صبح کو زندہ و سلامت اُٹھ سکوں گی۔ اور جب صبح ہوتی تو امید نہ رہتی کہ دن خیر و عافیت سے گزریگا۔ ڈاکٹروں کو تک ناامیدی ہوگئی تھی حالتِ یاس میں ایک دن اسی منحوس ماہ نومبر میں میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر کہا صاحب! میں کچھ وصیت کرنی چاہتی ہوں تمہاری ذات سے مجھے امید ہے کہ میری وصیت پر عمل کروگے۔ جانی[1]! دیکھو یہ بھائی بہن والدین کی امانت ہیں جہانتک تم سے ہوسکے ان کے ساتھ حسن سلوک رکھنا۔ اور جو محتاج امداد ہو اس کی مدد کرنا۔ حدیث شریف ہے کہ "تم میں وہ بہتر ہے جو اپنے اہل کے ساتھ نیک سلوک کرے۔" اگرچہ تم کو نصیحت کرنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ تم خود اس اصول پر کاربند ہو اور صاحب! اس علالت کے زمانہ میں تو نے ایسی ہمدردی کے ساتھ میری تیمار داری کی ہے کہ میرا رُواں رُواں تیرا شکر گزار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بعد میں بھی تو مجھے فاتحہ خیر سے یاد کیا کریگا۔ خداوند کریم تجھے عمر صحت اور اقبال عطا کرے!۔

یہ سن کر اپنے ہاتھ میرے گلے میں ڈال دیئے اور آنسو پیکر بولا۔ اپنی! آپ اسقدر مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کامل عطا کرے گا۔ اور یہ آپکے فرمانے کی بات ہے آپکے بھائی بہن میرے بھی تو بھائی بہن ہیں"

آہ مجھے خبر نہ تھی کہ میری وصیت پر ساکنان ملاءِ اعلیٰ ہنس رہے ہیں۔ ہائے صاحب! یا تو میں تجھے وصیت کررہی تھی یا آج تیرے بعد[2] تیری سرگذشت لکھنے بیٹھی ہوں۔

کسطرح سنبھالوں کہ دل زار نہ تڑپے کچھ دل کی کہوں قلب جو اکبار نہ تڑپے

---

[1] آپا جانی کو مخفف کرکے اکثر اپنی کہتے تھے۔

[2] میری زندگی اور رضا کی موت نے موت اور حیات کا مسئلہ حل کردیا۔ آہ! موت رضا کی اچانک موت کا نام ہے اور حیا میری بیجا زندگی کو کہتے ہیں ؎

غنچہ دہان من! بیا تنگدلی من ببیں بے تو ہنوز زیستم سنگدلی من ببیں

ولادت و طفولیت

صاحب تلنگنڈہ محلۂ بیجر لہ میں رات کے بارہ بجے کے بعد پیدا ہوا صبح کو دوشنبہ کا دن اور ماہ ذیقعدہ کی چوبیس تھی۔ اس کی ولادت کے وقت ابا جان گھر میں نہ تھے حیدر آباد گئے ہوئے تھے ان کے ایک دوست مولوی محمود حسین صاحب نے جو ہمارے پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ لڑکے کے تولد ہونے کی خبر دی۔ انداز اطلاع چونکہ نرالا تھا ابا جان کو بہت پسند آیا۔ لکھا تھا:—

سیدی روحی[1] فداک ۔ مبارک ہو سعادتمند بیٹا

چار پانچ دن کے بعد ابا جان تشریف لائے۔ نہایت مسرور۔ آتے ہی بڑی محبت سے نوزائیدہ بچہ کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ پیار کیا اور کہا کہ گو نواب (ابو الفتح نصر اللہ) چار بیٹیوں پر ہوا ہے مگر مجھے اس کے وقت اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اسکے لڑکا ہونے سے میرے دل کو یقین ہوتا ہے کہ میں بھی بیٹے کا باپ ہوں" نواب کے نام کی مناسبت سے ابو النصر فتح اللہ نام تجویز کیا۔ تاریخ نکالی[2]۔ اماںجان نے جب صاحبانی عرف رکھا۔

بچپن۔ بچوں کا پالنا کچھ آسان نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ سارا جوبن گھالے۔ تو ایک بالا پالے۔ یہ مثل صاحب کے لئے اماںجان پر جیسے صادق آتی ہے شاید ہی کسی

---

[1] ابا جان روحی تخلص بھی کرتے تھے۔

[2] ابا جان نے کئی مادے نکالے تھے۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ مادۂ تاریخ فرزند خوش جمال یا پسر خوشخصال ہے لیکن اب عدد نکالکر دیکھئے تو دونوں میں سے ایک بھی ٹھیک نہیں۔ ابا جان کا تمام کلام الٹ پلٹ کر دیکھ ڈالا مگر قطعہ تاریخ کا کچھ پتہ نہ چلا صاحب کا سنہ ولادت ۱۳۲۴ ہجری ہے۔

ماں پر آئے جیسی مصیبتوں میں یہ پلے کوئی بچہ کم پلا ہوگا جس طرح صاحب کو تمام اوصاف میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی ان کا بچپن بھی خاص خصوصیت رکھتا ہے۔ ایک تو خلقتاً[1] نحیف الجثہ پھر کامل دو سال تک صحت اچھی نہیں رہی۔ اس پر حد درجہ کے نازک مزاج۔ جاگنا بھی آفت اور سونا بھی غضب۔ جب تک جاگتے روتے رہتے اور جب سوتے مجال نہیں کہ گھر میں کنڈی کا تک کھٹکا ہو! یا کوئی جانور پکارے۔ ذرا آواز ہوئی اور فوراً ہشیار ہو کر رونا شروع کر دیا۔ ذرا طبیعت خراب ہوئی تمام رات روتے روتے صبح کر دی اور اماں بچاری اماں! انھیں نہ دن کو قرار تھا نہ رات کو آرام نہ کھانا چین سے نصیب ہوتا نہ سونا کئی کئی دن متواتر جاگتے گزرتی چھٹی[2] کے دن ساری رات بچہ کو گود میں لئے بیٹھی رہیں۔ اماجان تو ماں تھیں، اباجان گھنٹوں کندھے سے لگا کر ٹہلتے۔ کتنی کتنی دیر بیٹھکر کھیلا جھلتے رہتے۔ طاہرہ۔ رابعہ چھ چھ سات سات سال کی بچہ تھیں مگر اپنی بساط بھر وہ بھی بہلاتیں۔ چونکہ میں سب سے بڑی تھی (میں صاحب سے تیرہ سال بڑی تھی) قاعدہ کے مطابق اماجان کے بعد میرا نمبر تھا۔ اور وہ بھی بس میرے گلے کا ہار تھا۔

بودم از عہد ترا مونس و ہمدم ہمہ دم　　　در لحد بہر چہ بے مونس و ہمدم رفتی

آہ! اس وقت کسے توقع تھی کہ یہ نحیف و ناتوان بچہ جیے گا اور جوان ہو کر ایک جوہر قابل ثابت ہوگا۔

صاحب! جانی! تم نے کیسی مصیبتوں سے پرورش پائی۔ کیسی

---

[1] صاحب کی ولادت کے کوئی دو ماہ پیشتر سے اماجان کی طبیعت ناساز رہتی تھی ایک پاؤں میں درد آگیا تھا کہ حرکت کرنے سے سخت تکلیف ہوتی۔ بہر حال جب تولد ہوا تو نہایت لاغر تھا۔

[2] یکایک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

مشکلوں سے بڑے ہوئے۔ اور آہ! اتنی آسانی سے ہماری تمام محنتوں کو خاک میں ملا دیا۔

ہجر چہ آساں نمود وآہ چہ دشوار بود   آہ چہ دشوار بود و یار چہ آساں گرفت

کاش! اسی وقت مرجاتے کہ یہ غم نہ ہوتا۔ مگر نہیں تم کو تو دنیا میں ایک افسانہ چھوڑنا تھا۔ غیر معمولی زندگی اور غیر معمولی موت کا نمونہ دکھانا تھا۔

رفتی وحسرت توزیں دل حیراں نرود   غمت از دل نرود تا زغمت جاں نرود

دو سال ختم ہوکر جب تیسرا سال شروع ہوا تو اس کی صحت درست ہونے لگی اور درستگی صحت کے ساتھ وہ رونا اور چڑچڑاپن بالکل چھوڑ کر نہایت نیک اور غریب بچہ بن گیا۔ ایسی پیاری پیاری حرکتیں اور میٹھی میٹھی باتیں کرتا کہ اس کی خوش فعلیوں پر اپنے تو اپنے غیر تک صدقہ و قربان ہوتے۔ صورت بھی اچھی تھی۔ گورا گورا رنگ بھولا بھولا چہرہ۔ تین چار برس کی عمر میں اچھا رنگ روپ نکالا تھا۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس کے بچپن کی ایک ایک بات لکھوں۔ مگر عمر کوتاہ قصہ طولانی۔

تعلیم

بالائے سرش زہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

میری والدہ ایک تعلیم یافتہ اور فرائض شناس ماں تھیں بچوں کی تربیت و تعلیم کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ صاحب کو بھی بسم اللہ ہوتے ہی انھوں نے خود پڑھانا شروع کیا۔ اور چونکہ وہ بچوں کے لئے مدرسہ کی تعلیم کو ضروری سمجھتی تھیں نمکنڈہ برانچ اسکول میں داخل بھی کرادیا۔ لیکن چند روز کے بعد ہی ہم سب کو حیدرآباد آجانا پڑا۔ کیونکہ ابا جان کا تبادلہ ورنگل ہائی اسکول سے

مدرسہ دار العلوم کو ہو گیا تھا۔ یہاں آنے کے ایک مہینہ بعد ہی حیدر آباد میں پہلی مرتبہ پلیگ شروع ہوا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ پلیگ کے سبب مدارس بند رہے اور کچھ اسلئے کہ مکان کے قریب کوئی اچھا مدرسہ نہ تھا۔ ایک برس تک بچوں کو کسی مدرسہ میں شریک نہ کرواسکے۔ اسی اثناء میں اماں جان کا تقرر محبوبیہ گرلس اسکول میں ہو گیا۔ اب وہ کارمنصبی کی وجہ سے اپنے بچوں کی تعلیم میں حسب سابق مصروفیت نہیں رکھ سکتی تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اماں جان اور ابا جان دونوں کو صاحب کی تعلیم کا چنداں خیال نہ تھا۔ بلکہ ان کی تمام تر توجہ نواب کی طرف منعطف تھی اور اسی لئے اس کی تعلیمی رفتار بہ نسبت صاحب کے تیز رہی۔ بہرحال جب محلہ منگل ہاٹ چھوڑ کر کالی کمان میں مکان لیا تو تینوں بچوں کو مدرسہ دار العلوم میں داخل کرا دیا گیا۔

یہاں صاحب پانچویں جماعت تک پہنچا تھا کہ مدرسہ دار العلوم میں تبدیلی ہوگئی یعنے رشدیہ سے اوپر کی جماعتیں نامپلی منتقل کر دی گئیں۔ اور چونکہ ابا جان کے ذمہ اعلیٰ جماعتوں کی تعلیم تھی اس لئے بسبب دوری مدرسہ کالی کمان کا مکان چھوڑ دینا پڑا۔ اسی سال نواب امتحان رشدیہ سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ تو دار العلوم نامپلی جماعت مولوی میں شریک ہو گیا لیکن صاحب کے لئے بڑی دقت پیش آئی کیونکہ وہ دار العلوم نامپلی میں پڑھ نہ سکتا تھا اور دوسرے اسکول میں بسبب انگریزی نہ جاننے کے فرسٹ اسٹنڈرڈ میں شریک کرتے تھے۔ آخر ابا جان نے اپنے ایک شاگرد کو انگریزی پڑھانے پر مقرر کیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد جب ذرا استعداد پیدا ہوئی تو رزیڈنسی مڈل اسکول میں بہت کچھ کہہ سنکر تھرڈ اسٹینڈرڈ میں داخل کرایا۔ اور اسی وقت یعنی ۱۳۲۶ف سے اسکی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔

---

۱۰ اردی بہشت ۱۳۲۱ف

تھرڈ اسٹنڈرڈ میں تو اس کی انگریزی کمزور رہی لیکن فورتھ اسٹنڈرڈ اور فرسٹ فارم میں ہر مضمون میں فرسٹ ان کلاس رہتا۔ اس کی لیاقت کو دیکھکر سب استادوں نے ڈبل پروموشن دلانے کی از خود تحریک کی۔ مگر ابا جان نے (چونکہ ڈبل پروموشن کو بچوں کے لئے حارج ترقی سمجھتے تھے) اس تجویز کو نامنظور کیا۔ جب اماں جان نے بھی اصرار کیا تو کہا کہ "صاحب پر زیادہ بار نہیں ڈالنا چاہیئے اس کی تعلیم کو اسی پر چھوڑ دو وہ رفتہ رفتہ ترقی کرلے گا"۔ لیکن فرسٹ فارم کے سالانہ امتحان میں اعزازی مارکس لینے کی وجہ سے (صہ) روپیہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔

اس زمانہ میں ہمارا پورا[1] گھر ملیریا بخار میں مبتلا ہو گیا تھا۔ صاحب بھی اس لپیٹ میں آگیا۔ کہ اس پر سال میں دو تین حملے بخار کے ہوتے اور جب بخار آتا تو چار چار پانچ پانچ درجہ پر پہنچکر دم لیتا۔ اور ہفتوں سلسلہ چلتا۔ دو سال سے زائد بخار کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر آئے دن کی غیر حاضری کے باوجود وہ اپنی کلاس میں برابر ترقی کرتا رہا۔

امتحان مڈل کے لئے چھ مہینے باقی تھے۔ اور ملیریا ایک صاحب ہی کو کیا سارے گھر کو پریشان کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے بہ تنگ ہو کر تبدیل مقام کی رائے دی۔ چنانچہ ابا جان اماں جان معہ سب بچوں کے بغرض تبدیل آب و ہوا ہنگلنڈہ گئے اور سب کے سب وہاں کے مشنری ڈاکٹر ٹیمپنی صاحب کے ہاں رجوع کر دیئے گئے۔

تین مہینے کے بعد جب ذرا سب کی طبیعتیں سنبھلیں تو خیال ہو رہا تھا کہ

---

[1] بخار کی ابتدا رابعہ سے ہوئی پھر یکے بعد دیگرے نو ابجے سواسب مبتلا ہو گئے اور تقریباً پانچ سال یہ آفت رہی ایک اچھا نہ ہونے پاتا کہ دوسرا مبتلا ہو جاتا بعض وقت سب کے سب لوٹ پوٹ ہو جاتے اور گھر ہسپتال کا نمونہ بن جاتا۔

کہ خط لکھکر دریافت کریں کہ آیا فتح اللہ امتحان مڈل میں شرکت کر سکتا ہے یا نہیں جو بلا دریافت ہیڈ ماسٹر اڈالفس صاحب کا خط صاحب کے نام آیا کہ میں نے تمہارا فارم اور فیس شرکت خود داخل کر دی ہے۔ اب تم آجاؤ تو بہتر ہے۔" ہائے صاحب تو بچپن ہی میں اپنے مدرسہ میں کتنا وقیع تھا۔ اور استادوں کو تیری کامیابی کا کس درجہ یقین تھا۔

واپس آکر صرف چوبیس دن اسکول اٹینڈ کیا تھا جو امتحان شروع ہو گیا ابھی امتحان ختم ہی ہوا تھا کہ ہم پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ابا جان صرف ایک ہفتہ مرض نمونیہ میں مبتلا رہ کر ۲۰ / خورداد ۱۳۳۳ف کو راہی ملک بقا ہوئے۔

گھر کے وارث کا اٹھ جانا کوئی معمولی مصیبت نہ تھی لیکن اس وقت اماں جان نے ہمت مردانہ سے کام لیا۔ ہر چند دوست احباب نے اصرار کیا کہ والد کے حسن خدمت کے عوض نواب کی (جو اس وقت ایف۔ اے میں تھا) ملازمت کے لیے کوشش کی جائے مگر انھوں نے نہایت استقلال سے جواب دیا میں اس کی تعلیم میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتی اور باوجود اس کے کہ ابا جان کے انتقال سے سب بار ان پر پڑ گیا تھا لیکن انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم برابر جاری رکھی۔

ابا جان کو صاحب کے امتحان سے بڑی مسرت ہوئی تھی۔ اظہار بھی کیا کہ اب میرا یہ بیٹا بھی اس قابل ہو گیا کہ سرکاری امتحان میں شریک ہو

---

[1] میرے والد (مولوی احمد مدنی صاحب صدر مدرس مدرسہ مستعد اران) نے ۱۲۹۹ف سے ۱۳۳۰ف تک یعنی اکتالیس سال نہایت تندہی کیساتھ سرکاری خدمت انجام دی۔ چونکہ انتقال سے چار برس پیشتر صرف خاص مبارک میں منتقل ہو کر دیوانی سے وظیفہ لے لیا تھا۔ بنا برآں ان کے اہل و عیال کے واسطے (دیوانی سے) قطعہ پنشن منظور ہوئی۔ بہ وقت وفات (صرف خاص میں) مامور بہ خدمت ہی تھے۔ (وظیفہ ۲۵ و ۵۰ اور تنخواہ ماہ) تھی۔

حالت علالت میں بچوں سے متعلق دریافت کرتے اور خوش ہوتے تھے مگر افسوس صد ہزار افسوس! جب نتیجہ نکلا وہ بچے خوش ہونے والے نہ تھے۔ صاحب فرسٹ کلاس، فرسٹ ان اسکول اور فارسی میں فرسٹ ان ڈومینیز تھا جس پر اس کو (للعہ) روپیہ میرٹ اسکالرشپ دیا گیا۔ اور وہ گورنمنٹ ہائی اسکول (چادر گھاٹ) میں شریک ہو گیا۔ یہاں بھی اس نے اپنا جوہر قابلیت دکھایا۔ کہ چند ہی روز میں سب استادوں کا منظورِ نظر بن گیا خصوصاً آغا طہرانی صاحب کی تو اسقدر نظر عنایت تھی کہ ہم جماعت لڑکے چھیڑنے کے لئے "آغا چہ" کہنے لگے۔ اور آغا فتح اللہ تو وہ اتنا مشہور ہوا کہ ایک عرصہ تک لوگ اس کو ایرانی سمجھتے تھے۔

ابا جان کے انتقال سے خاندان جو گوناگوں مشکلات میں پھنسا ہوا تھا ابھی اس سے پوری طرح چھٹکارا بھی نصیب نہیں ہوا تھا کہ چرخ شعبدہ باز نے پھر رنگ بدلا۔

ہر دم زمانہ داغ دگر گونہ در دہد ‍ ‍ ‍ ‍ اک داغ نیک ناشدہ داغ دگر دہد

اما نجان جن کو چھ[1] سال کی محنت و جانکاہی کے صلہ میں ٹائیم اسکیل کی رو سے ماہوار تا ہماہوار کا گریڈ دیا گیا تھا۔ اور جس کی تنخواہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے صرف آٹھ[2] مہینے اٹھائی تھی سخت علیل ہوئیں۔ اور چار مہینے سے زیادہ بیماری کی جانکاہ اذیتیں سہہ کر ۸ ار آبان ۱۳۳۲ف کو سکونِ جاودانی حاصل کیا۔

---

[1] خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ اردو ڈپارٹمنٹ بہمن ۱۳۲۶ف م ڈسمبر ۱۹۱۶ء میں بمرض فالج مبتلا ہوئیں تو ان کے زمانہ رخصت و نیز مستعفی ہونیکے بعد بھی والدہ (رقیہ بیگم صاحبہ) عارضی طور سے اس خدمت کو انجام دیتی رہیں جس کا ان کو ماہوار الاؤنس دیا جاتا تھا۔ پھر تنخواہ امرداد ۱۳۳۲ف میں مستقلاً (ماہوار ۱۵۰) کر دی گئی۔ بعدہٗ فروردی ۱۳۳۱ف میں مذکورہ گریڈ دیا گیا۔

[2] بقایا بعد انتقال ملا۔

اماں کا زمانہ تھا۔ حالت طوفان میں جہاز کے لنگر کا ٹوٹ جانا تھا۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

لیکن مشیت ایزدی کے آگے سوائے سر جھکا دینے کے چارہ ہی کیا ہے۔

والدہ کے انتقال کے وقت صاحب[1] سکستھ فارم میں تھا۔ گو ان کی حواس باختہ کر دینے والی علالت اور وفات نے اس کی صحت کو (جو ورنگل سے واپسی کے بعد بالکل ٹھیک ہو گئی تھی) پھر نقصان پہنچایا لیکن بہت جلد سنبھل گئی اور پیشتر سے بھی زیادہ نفس کشی[2] کے ساتھ اپنی تعلیم میں مشغول ہو گیا۔

امتحان ایچ. ایس. ایل. سی ۱۳۳۲ف میں نتیجہ کے وقت دو طالب علم گورنمنٹ ہائی اسکول سے فتح اللہ اور سٹی ہائی اسکول سے بھگونتم (نامی ایک طالب علم) حریف مقابل ہو گئے۔ ہوا یہ تھا کہ صاحب نے ہائی اسکول میں "کامرس" بطور مضمون زاید لیا تھا۔ پس اگر کامرس کے نمبر منہا کر دئے جاتے تو یہ فرسٹ ان ڈومینینز

---

[1] متعلقین (ایک ضعیف و بے سہارا ماں، چار ناکتخدا لڑکیاں (میں اور رابعہ برسرکار تھے) تین طالب علم لڑکے ابا جانی کی ایک بیوہ اور انکی دو یتیم لڑکیاں) کو بے کس و بے وسیلہ چھوڑا جنکی پرورش کیلئے سرکار سے حسب ضابطہ (لعہ۹) روپیہ پنشن مقرر ہوئی کیونکہ مدت ملازمت ساڑھے گیارہ سال تھی۔

[2] والدہ کے انتقال کو چند روز ہوئے تھے کہ کامرس ٹیچر نے (جن کو اس حادثہ عظیم کی خبر تھی) صاحب کو اطلاع دی کہ بنگال بنک میں ایک جائداد (للعہ) کی تقرر طلب ہے۔ بنک منیجر کی چٹھی میرے پاس آئی ہے کہ اس کیلئے کسی ہوشیار طالب علم (کامرس) کا انتخاب کروں اگر آپکی مرضی ہو تو میں آپ کیلئے تحریک کرتا ہوں۔ صاحب نے مجھ سے رائے طلب کی بلکہ خانگی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے ملازمت قبول کرنے پر اصرار کیا۔ میں نے مخالفت کرتے ہوئے کہا میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ذرا سی منفعت کیلئے تمہاری تعلیم موقوف اور قابلیت برباد کی جائے تم کو معلوم ہے کہ تمہارے والدین کی دلی آرزو بس یہی ایک تھی کہ ان کی اولاد ترقی حاصل کرے۔ پس اب تمہارا فریضہ ہے کہ اپنے والدین کی یہ تمنا انکے بعد پوری کرو۔ صاحب یہ سنکر بہت متاثر ہوا اور آئندہ اس نے آخر وقت تک اپنا مطمح نظر یہی قرار دیا۔

ٹھیرتا۔ اور اگر کامرس کے نمبر شریک کئے جاتے تو (۱۱) نمبر سے بھگوتم سے کم ہو جاتا۔ تقریباً دو ماہ یہ معاملہ زیر بحث رہا کہ دونوں میں کس کو گولڈ میڈل اسکالرشپ کا مستحق قرار دیا جائے آخر اراکین کمیٹی نے فیصلہ بھگوتم کے حق میں صادر کیا اور شاکراس[1] صاحب اور اعظم[2] صاحب نے اس کے لئے (۲۰) روپیہ اسپیشل اسکالرشپ کی تحریک کی۔ مگر ایک عرصہ تک اس تحریک نے عملی صورت اختیار نہ کی۔ کیونکہ اسی زمانہ میں شاکراس صاحب کا تبادلہ نوبل کالج پر ہو گیا۔

چونکہ امتحان میں فرسٹ کلاس۔ فرسٹ ان اسکول اور چار مضامین فارسی ترجمہ۔ ریاضی (لازمی) اور غالباً کامرس میں فرسٹ ان ڈومینیز۔ نکلا تھا چنانچہ اسکول سے اس کو شاکراس گولڈ میڈل (بعہد محمد کپتھال صاحب پرنسپل) عطا کیا گیا۔ اور اس کا نام بورڈ پر سنہری حروف سے لکھا گیا۔

اسی سال نواب بھی بی۔ اے ہوا لیکن مالی موانعات کی وجہ سے اس کی تعلیم کا سلسلہ بمجبوری[3] منقطع کر دینا پڑا۔ اور صاحب نظام کالج میں داخل ہو گیا۔ چونکہ کالج کے پہلے امتحان ششماہی میں وہ اول رہا تھا۔ برنٹ صاحب پرنسپل کالج نے مذکورہ بالا اسکالرشپ کی اجرائی کے واسطے خود کوشش کی اور غالباً ایک برس کے بعد بجائے (۲۰) کے (۱۵) روپیہ منظور ہو جو چار سال تک ملتے رہے۔

کالج میں بھی وہ اپنی دماغی قابلیت۔ محنت و توجہ اور پسندیدہ اطوار کی بناء پر بہترین طلباء میں شمار ہوتا رہا کہ پرنسپل پروفیسر بلکہ ہم جماعت تک محبت و توقیر سے پیش آتے تھے۔

---

[1] پرنسپل گورنمنٹ ہائی اسکول۔

[2] پرنسپل سٹی ہائی اسکول۔

[3] والدہ کا خیال بی۔ اے کے بعد انجنیرنگ کے لئے اسے یورپ بھیجنے کا تھا۔

ایف ۔ اے ۔ کے سلیکشن سے ایک روز پیشتر اس کو ایکا ایک بخار ہو گیا ۔ اور شام ہوتے ہوتے ایک سو پانچ درجہ پر پہنچ گیا ۔ ہائے اس دن کی اسکی بیقراری! بخار چڑھا ہوا ہے ۔ سر پر برف کے پانی میں بھگو کر کپڑا رکھا جا رہا ہے ۔ اور اس کو رٹ لگی ہوئی ہے کہ "میرا امتحان! ارے میری پیٹھ میں اتنا درد ہو رہا ہے میں کل چھ گھنٹے کیسے لکھونگا" ادھر میں سمجھا رہی ہوں ۔ ادھر خالہ جان کہہ رہی ہیں ۔ بیٹا! تم اسوقت اپنے دماغ کو امتحان کے خیال میں نہ الجھاؤ ۔ خدا نہ کرے بخار تیز ہو جائیگا ۔ امتحان جان سے بڑھکر نہیں مگر وہ آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر یہی کہے جاتا ہے ۔ کہ "آپا! میں اب تک ایک کلاس میں دو سال کبھی نہیں رہا تھا ۔ آٹھ بجے رات سے بارہ بجے تک چار گھنٹے ایک بحرانی کیفیت رہی ۔ خود روتا اور ہمکو رلاتا رہا ۔ آدھی رات کے بعد بخار میں ذرا تخفیف ہوئی تو آنکھ لگی ۔

طبیعت کے سنبھلنے تک امتحان تقریباً ختم ہو چکا تھا ۔ صرف آخری تین پرچوں میں بیٹھ سکا ۔ اور تینوں میں اول رہا ۔ خیر امتحان کے بعد ڈاکٹر کو سکر کے صداقت نامہ کے ساتھ امتحان میں انتخاب کر لینے کے لئے عرضی پیش کی تو برنٹ صاحب نے ہنسکر کہا ...... "O! You are selected!"

لیکن پھر بھی اس امتحان کی غیر حاضری نے اسکو نقصان ہی پہنچایا ۔ کہ سالانہ انعام جو سال اول ملا تھا نہیں مل سکا ۔ اور اس کا اسے ملال بھی ہوا ۔

مدراس یونیورسٹی سے ۱۳۳۵ف میں ایف ۔ اے فرسٹ کلاس کامیاب کیا اور بی ۔ اے ۔ کے لئے نظام کالج ہی میں شریک ہو گیا ۔ مگر شاید ایک مہینے کے بعد ہی عثمانیہ کالج میں منتقل ہو گیا ۔ تبدیلی کالج کی وجہ بظاہر تو

---

(۱) خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ چار سال سے وہ اور ہم ایک ہی مکان میں سکونت رکھتے ہیں ۔ کتاب ہذا میں خالہ جان سے مراد صاحبہ موصوفہ ہی ہیں ۔

یہ تھی کہ نظام کالج میں انتخاب مضامین میں کچھ دقت پیش آرہی تھی۔
لیکن اصلی وجہ یہ تھی کہ اس نے اسی سال ایشیاٹک اسکالرشپ کی درخواست
دی تھی جسمیں منصرم پرنسپل صاحب نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ان کے مہربان
برنٹ[1] صاحب ولایت گئے ہوئے تھے۔ بہرحال وہ وظیفہ منظور نہیں ہوا جسپر
اس نے بددل ہوکر کالج چھوڑ دیا۔

بی۔ اے عثمانیہ میں صاحب کو ابتداءً بڑی دقت معلوم ہوئی۔
ایک تو طریق تعلیم جداگانہ۔ دوسرے مضامین بالکل نئے۔ معاشیات۔
تاریخ اسلام۔ دینیات وغیرہ سب ایسے مضامین تھے جو اس نے ایف۔ اے
میں نہیں لئے تھے۔ لیکن اپنی خداداد قابلیت و ذہانت۔ محنت وجانفشانی
سے بہت جلد اس نے اس کمی کو پورا کرلیا۔ اور چند ہی عرصہ میں وہی درجہ
حاصل کیا جو اس کو اب تک ہر ایک درسگاہ میں حاصل تھا۔

۱۳۳۷ف میں صاحب۔ بی۔ اے اگرچہ سکنڈ کلاس کامیاب ہوا
اور اس کا اس نے بڑا ہی رنج کیا۔ لیکن سب نے یہ کھکر سمجھایا کہ کوئی
دوسرا فرسٹ کلاس نکلا ہی نہیں۔ تاہم انگریزی میں اول تھا۔ اگر حیدرآباد
سیول سروس میں منتخب نہ ہوجاتا اس کو (۵۰) روپیہ وظیفہ[2] دیا جاتا۔ اور
ارادہ بھی یہی تھا کہ اگر انتخاب نہ ہو تو ایم۔ اے کے لئے علیگڈھ چلا جائے۔
ایچ۔ سی۔ ایس۔ کے لئے درخواست دینے کی نواب کے سوا ہم
میں سے کسی کی رائے نہ تھی۔ کیونکہ دو سال پیشتر ایشیاٹک اسکالرشپ کی
کوشش میں ناکامی ہوچکی تھی۔ لیکن بھائی کے اصرار پر اللہ کا نام لیکر اس نے
بھی درخواست داخل کردی۔ خدا کی قدرت! کہ بغیر سعی نومینشن ہوگیا۔

---

[1] پرنسپل نظام کالج
[2] یہ وظیفہ سکنڈ طالبعلم محمد عثمان کو دیا گیا۔

نامزد ہونے کے بعد انتخابی امتحانات تحریری و تقریری شروع ہوئے۔ اور غریب بچہ ابھی بی۔ اے کا امتحان دیکر دم بھی لینے نہ پایا تھا کہ اس میں گھٹ گیا۔

خیر انتخاب ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نمبر سکنڈ ہے۔ اور وہ حسب اطلاع نامہ ۴ر اگسٹ ۱۹۲۸ء کو سوماجی گوڑہ سیول سروس ہوم چلا گیا۔

ایچ۔ سی۔ ایس میں علاوہ قانون کے یہ دو چیزیں زبان مرہٹی اور گھوڑے کی سواری اس کے لئے جدید تھیں۔ قانون سے تو اسکو دلچسپی تھی اور مرہٹی میں بھی چندے محنت کرکے سب پر فوقیت حاصل کرلی۔ مگر سواری آہ! سواری کے واسطے اسکو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ کئی مرتبہ سخت زین پر بیٹھنے سے جسم چھل گیا۔ اکثر پاؤں کو چوٹ لگ جاتی۔ اور زخم پر ایوڈین لگاکر کتنی کتنی دیر تک تڑپتا۔ ایک دن یہ کیفیت مجھ سے بیان کرتے ہوئے کہا۔ کہ مارے جلن کے میں مرگیا آپا! آہ! اس کا یہ فقرہ یاد آتا ہے تو میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ ہائے ساری محنت اکارت گئی۔ کامیابی کے بعد ایک وقت بھی اس سے کام لینے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ اس کو اسکا بڑا اندیشہ تھا کہ سواری میں کہیں فیل نہ ہو جائے۔ اسلئے باوجود سخت دقت محسوس کرنے کے اپنے آپ پر جبر کرکے پابندی کے ساتھ برابر سیکھتا رہا۔ اور وہ غیرت والا اس میں بھی ناکام نہیں ہوا۔

صاحب کو سیول سروس میں اول آنے کی تمنا تھی ششماہی امتحان میں فرسٹ آیا۔ تو اس کو مطلق خوشی نہیں ہوئی۔ کہا۔ "اس کا کیا ہے۔ فینل میں فرسٹ نکلیں تو جب بات ہے۔"

سالانہ (آخری) امتحان دینے کے بعد اس کو اول آنے کی امید نہ تھی

ختم امتحان پر ایک دن گھر آیا۔ تو ہم سب نے پوچھا "کہو صاحب پرچے کیسے رہے؟" نہایت افسردگی سے بولا جن پرچوں کو اچھا کرنیکی امید تھی وہی بگڑ گئے فرسٹ تو ایک طرف۔ اگر پاس ہی ہو جائیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اسکو افسردہ پاکر رابعہ نے کہا "خیر تم رنجیدہ نہ ہو۔ بلا سے اچھے نہیں ہوئے نہیں سہی۔ نہیں تو نہیں جانی! فرسٹ۔ تم سلامت رہو تو بس ہے۔ اگر تم خدا نخواستہ فیل بھی ہو گئے تو کچھ پروا نہیں"۔ اس پر بے انتہا پر اثر لہجہ میں کہا۔ "نہیں آپا یہ نہ کہیے۔ بدنامی کے جینے سے نیک نامی کا مرنا ہزار درجہ بہتر ہے"۔ جب واپس جانے لگا تو خلاف عادت نانی کے گلے سے لپٹکر کہا۔ "امی میرے اول آنیکی دعا کیجیے"۔

آہ! ایچ۔ سی۔ ایس کا نتیجہ لکھنے کی دل میں تاب نہیں۔ اطلاع نامہ کی نقل درج ذیل ہے:۔

H. E. H. The Nizam's Government
No. 311 Hyderabad Civil Service Board,
Hyderabad-Deccan. 15th Aug. 1929.

From K. M ANSARI, Esqr., H. C. S.
Secretary, H. C. S. Board,
Hyderabad-Deccan.

To ABUN-NASR FATHULLA. Esqr..

Sir,

I am glad to inform you that the H. C. S. Selection Committee in their meeting held on the 25th Shehrewar 1338 F. have declared you to have passed the Final Examination of the H. C. S. class held in July 1929 and have allotted you to the Judicial Department. You are therefore requested to report yourself immediately to the Chief Justice

amination of the H. C. S. class held in July 1929 and have allotted you to the Judicial Department. You are therefore requested to report yourself immediately to the Chief Justice

The H. C. S. Committee have also decided that the Walker Gold Medal[ف ۱] should be awarded to you for having stood first in the Examination.

The Accountant-General is being instructed to pay you an allowance of O. S. Rs. 300/- p. m. from the date of your passing the Examination, viz., 25th Shehrewar 1338 F.

I have the honour to be,
Sir,
Your most obedient servant
(Sd.) K. M. ANSARI,
Secretary.

صاحب نے اپنی تعلیم میں جو کچھ ترقی حاصل کی وہ محض انکی ذاتی توجہ محنت اور جانفشانی کا نتیجہ ہے ۔ صرف جماعت میں سبقت کی خواہش اور غیرتمندی جو اسکی طبیعت میں تھی ۔ وہی اسکی رہنما ہوئی ۔ ورنہ نہ کوئی اس کو تنبیہ و تادیب کرنے والا تھا ۔ نہ ایک لفظ کی مدد دینے والا نہ سر پر ماں نہ باپ[ف ۲] ۔ نہ چچا نہ ماموں ۔ بڑا بھائی صرف دو سال بڑا بہنیں گھر کی بیٹھنے والیاں ۔ ملی موانعات الگ سد راہ تعلیم تھے تو گھر کی پریشانیاں

ف ۱ - یہ تمغہ انکی تصویر کے ساتھ بطور یادگار سیول سروس ہوس میں رکھا گیا ہے ۔
ف ۲ - والدہ اکلوتی تھیں ۔ اور ابا جان بھی یہاں ہند میں تنہا ہی تھے کیونکہ انکا خاندان مدینہ طیبہ میں سکونت پذیر ہے ۔

جدا جاج ہوتی تھیں۔ مگر وہ نیک نامی کا شیدائی تمام مشکلات[ف] کو پیچھے ڈالکر برابر ترقی کیے گیا۔ رات کا وقت ہے۔ چراغ ہے۔ کتاب ہے اور وہ ہے۔ امتحان بی۔اے کے عین سنہ پر جبیہ (سب سے چھوٹی بہن) کی شادی ٹھیر گئی۔ تو شادی کی گڑبڑ ایک طرف تھی۔ اور وہ ایک طرف آدھی۔آدھی رات تک پڑھ رہا ہے۔ اس کی ایسی محنت شاقہ سے دل کڑھتا تھا۔ منع کرتے تھے۔ چراغ سامنے سے اٹھا لیتے۔ مگر وہ کبھی جھلانے لگتا کبھی منتیں کرتا کہ ایک صفحہ اور پڑھ لینے دو۔

ہائے صاحب! میرے نفس کش میرے ناشاد و نامراد بچے! کیا تیری زندگی کا مقصد محض طالبعلمی تھا۔ کیا تو صرف محنت و جانکاہی کے واسطے پیدا ہوا تھا۔ کہ ادھر طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا۔ اور ادھر تیری عمر ختم ہو گئی۔ آہ۔

صیاد نے کب ناوک بیداد لگایا
جب شاخ سے ہم اڑنے کو پر تول رہے تھے۔

اللہ! امانجان کے بعد سے غم و الم کا ہجوم تھا۔ چاروں طرف یاس و حرمان کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ مگر اب وہ بادل نظروں کے سامنے سے ذرا ہٹ رہے تھے۔ اور ایک گوشہ میں یہ چاند چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ امید بندھ رہی تھی۔ کہ یہ ہلال (میرے اللہ! ہلال ہی تھا۔ پہلی رات کا چاند کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہیں) بڑھکر بدر بنے گا۔ اور اسکی روشنی سے آنکھوں کو نور دل کو سرور حاصل ہوگا۔

ف نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے اس کے متعلق سیول سروس انتخابی کمیٹی میں جو رائے دی تھی تو ایک یہ فقرہ بھی فرمایا تھا This boy has faught his way up میٹرک کی کامیابی سے عہدہ وزارت متعلقہ اسکی تعلیمی جد و جہد سے ایک حد تک واقف ہو گئے تھے۔

رہ گیا دیکھ چاند دکھائی — چاند ہوا پر عید نہ آئی
رت بدلی پر ہوئی نہ برکھا — بادل گرجا اور نہ برسا
آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ — پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ

آہ! تخم امید ابھی دل میں جمنے بھی نہ پایا تھا کہ برق اجل نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

وہ شمع کہ جس سے تھی میری بزم کی رونق
صرصر کو نہ لازم تھا سر شام بجھانا۔

اخلاق و عادات

قرنہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

صاحب کی زندگی میں سب سے اہم۔ شاندار۔ روشن۔ اور آہ! سب سے زیادہ کلیجہ برمانے والی اور دل کو خون کرنے والی جو بات ہے وہ اس کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف جمیلہ ہیں۔ وہ بیحد شریف النفس تھا۔ بچپن سے اس کے خیالات اس کے جذبات اس کے اوضاع و اطوار نہایت شریفانہ تھے۔ عموماً بچوں کو بد اخلاقی سے روکنے کیلئے تنبیہ و تہدید سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر صاحب کے لئے اس کی نوبت ہی نہ آنے پائی۔

احتراز معصیت۔ وہ فطرتاً بدی سے متنفر تھا۔ کبھی اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جس پر معصیت کا اطلاق ہو سکے۔ وہ لڑکپن میں بھی جھوٹ نہیں بولا۔ کوئی چیز چھپا کر نہیں کھائی کبھی ایک پیسہ کا تغلب نہیں کیا

بھول کر سگریٹ کو منہ نہیں لگایا۔ بری صحبتوں میں شریک نہیں ہوا۔ رقص و سرود کے جلسوں تھیٹروں۔ میلوں وغیرہ سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ ہاں کبھی کبھار (اندنوں پچیس میں نہیں) سینما چلے جاتے۔ وہ بھی بدرجہ مجبوری دوستوں کے اصرار سے۔ ورنہ آپ بھلے اپنا گھر بھلا اپنا کام بھلا۔ انہیں لڑکوں سے اسکی دوستی ہوتی جن کے اخلاق و عادات شریفانہ ہوں۔ تضیع وقت کرنے والے۔ آوارہ مزاج لوگوں سے وہ دور بھاگتا تھا۔ اب تو اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر انسان برائی سے بچنا چاہے تو اس۔ راستہ ہی پر نہیں جانا چاہئے۔ کاجل کی کوٹھری میں جاکر بغیر دھبہ کے نکلنا بہت مشکل کام ہے۔ اکثر اکبر مرحوم کا یہ قطعہ پڑھا کرتا تھا۔

دنیا کی جسکو شرم ہے مرد شریف ہے
جسکو خدا کی شرم ہے وہ ہے بزرگ دین
فطرت کا وہ ذلیل ہے دلکا کثیف ہے
جسکو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں

مذہبیت۔ اگرچہ وہ زاہد مرتاض نہ تھا۔ اور نہ اس کی عمر و حالت اسکی متقاضی تھی لیکن باوجود نوجوانی اور انگریزی تعلیم کے وہ آجکل کی دہریت سے مبرا تھا۔ صوم وصلواۃ کا بھی پابند تھا۔ اور اس کے مذہبی خیالات نہایت پختہ تھے۔ وہ ہمیشہ خدا پر بھروسہ کرتا اور ہر ایک بات کو اسی سے منسوب کرتا تھا۔ ایچ۔ سی۔ ایس میں اول آنے پر خالہ جان نے ایک مرتبہ کہا "بیٹا! یہ تمہاری محنتوں کا صلہ ہے" تو اس نے عجب انکسار سے جواب دیا "جی نہیں خالہ جان! یہ محض تائید ایزدی تھی" اس پر خالہ جان نے پھر کہا "ہاں یہ تو سچ ہے۔ مگر خدا بھی اسی وقت مدد کرتا ہے۔ جب انسان خود بھی کچھ کرے" تو کہا "یہ آپ ہی کی دعاؤں کی برکت ہے"۔

بےنفسی و قناعت۔ صاحب کا دل خواہشات نفسانی سے بالکل

پاک تھا۔ کبھی نہ اس نے لذیذ کھانے کی خواہش کی۔ نہ عمدہ کپڑے کی۔ جو سامنے رکھدیا۔ کھالیا۔ جو بنا دیا سو پہن لیا۔ اگر بالفرض دسترخوان پر اس کے آگے صرف دال ہی ہوتی تو یہہ بھی نہ پوچھتا کہ سالن کہاں ہے؟ نہ اس کو کوئی چیز پسند تھی نہ ناپسند۔ اور اماں کے انتقال کے بعد سے تو یہ صفت بہت بڑھ گئی تھی۔ ٹوپی پرانی ہوگئی ہے۔ بوٹ خراب ہے۔ آپ اسی طرح مدرسہ چلے جا رہے ہیں۔ کبھی اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے بوٹ کی ضرورت ہے۔ یا فلاں کپڑا میں خریدنا چاہتا ہوں۔ نظام کالج میں بھی داخل ہو کر اس نے سوٹ بوٹ کا شوق نہیں کیا۔ بناؤ سنگھار کی طرف مائل نہیں ہوا۔ ضرورت کی چیز گھڑی۔ عینک۔ فونٹن پن تک نہیں خریدی۔ اگر کوئی اس کی سادہ وضع پر نکتہ چینی کرتا۔ تو جواب دیتا کہ یہ طالب علمی کے شایاں نہیں۔ کبھی کہتا کہ ان چیزوں سے انسان کی عزت نہیں ہوتی۔ اسکی اس صفت پر بعض دوست اسکو مردہ دل (Lifeless) اور بعض ولی (Saint) کہتے تھے۔ لیکن وہ نہ کسی کی تعریض کی پروا کرتا نہ تعریف کی۔ اسکی اندرونی کوشش یہی رہتی کہ حتی الامکان اپنی ذات پر پیسہ کم صرف کرے اور اپنی خواہشات مارتا اور جذبات کو دباتا تھا۔ تمام عمر میں یہ خواہش یا بضرورت سولین ہو کر یہ کپڑے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے۔ مگر میرے اللہ! وہ کیسی منحوس گھڑی بنے تھے کہ اس کو پہننے تک نصیب نہیں ہوئے۔ اکثر کی تو تہ تک ٹوٹنے نہ پائی۔

دولت از بیچ ممر شاد نشد در عالم   حیف صد حیف کہ ناشاد ز عالم رفتی

اعلیٰ ظرفی۔ اپنے اخراجات میں تو وہ مقدور بھر کفایت پر نظر رکھتا لیکن دوسروں کی فضول خرچیوں پر بھی کوئی اعتراض نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ اپنی

ضرورت پر بھائی بہنوں کی ضرورت کو مقدم سمجھتا۔ اپنا وظیفہ جتنا ملتا پورے کا پورا لاکر حوالہ کر دیتا۔ اس میں سے بضرورت بھی خود کچھ خرچ کرنا تو درکنار۔ اپنی کتابوں یا فیس کے لئے مانگنا بھی گویا اس کے نزدیک تنگ دلی اور کم حوصلگی تھی۔

غیرت مندی ۔ غیرت و خودداری اس کے خمیر میں حفظ نفس اور پاس عزت اسکی سرشت میں داخل تھے۔ عالم بے تمیزی میں بھی اسکی یہ صفت خاص طور سے نمایاں تھی۔ ایک مرتبہ جبکہ اسکا سن ایک سال سے زاید نہ تھا۔ اباجان بوقت صبح مطالعہ کر رہے تھے۔ خود گھٹنیوں چلتا ہوا انکے قریب گیا اور اپنی جانب متوجہ کرنے لگا۔ چونکہ اباجان مصروف تھے اسکی طرف توجہ نہ کی۔ اس نے جھلا کر کتاب پکڑکر جو کھینچی تو ایک ورق پھٹ گیا۔ کتاب کے پھٹنے پر اباجان نے اس کے ہاتھ پر ایک چٹکی ماری۔ اس وقت تو خیر رونے لگا لیکن اس روز تمام دن ہرگز اباجان کی گود میں نہیں گیا۔ وہ کتنا کتنا سمجھا کر خوشامدیں کرکے اپنے پاس بلاتے رہے کہ "میرے بیٹے کو بہت غصہ آگیا۔ بڑی چوٹ لگ گئی۔ اچھا قصور ہوا۔ اب جانے دو معاف کر دو۔" مگر وہ شام تک بگڑا ہی رہا۔ اباجان ادھر سے آکر لینا چاہتے تو اُدھر منہ پھیر لیتا۔ اور اُدھر آتے تو ادھر پلٹ جاتا۔

وہ بچپن میں بھی کوئی ایسی بات گوارا نہیں کرسکتا تھا جو اس کی شخصیت کے منافی ہو۔ ایک دن اماںجان اسے صاد (ص) لکھنا سکھا رہی تھیں۔ لیکن شاید اسوقت جی نہیں چاہتا تھا کہ بڑی بیدلی سے لکھ رہا تھا۔ اماں جان نے دھمکی کے طور پر کہا (ماری تو اسے برداشت تھی نہیں) دیکھو تو پڑھنا لکھنا نہیں۔ تو صاحب نہیں سائنٹا (ایک سائنس کا نام تھا) بنے۔ آج سے

میں تجھے سائنا پکارونگی"۔ بس اماں کا اتنا کہنا تھا کہ اللہ نہیں! کہکر ایک ایسی چیخ ماری کہ نانا ابا گھبرا کر اپنی کوٹھڑی سے نکل آئے۔ اس کے بلبلا کر رونے پر اماں کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اور وہ اس کے چھیڑنے کیلئے بار بار کہنے لگیں کہ نہیں نہیں تو صاحب نہیں تو سائنا ہے۔ اور وہ ہر دفعہ تڑپ تڑپ کر چیختا۔ کہ اللہ نہیں! سائنا نہیں۔ کچھ دیر تو نانا ابا[ف۱] کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے پھر یہ کہکر کہ نہیں نہیں بی نہیں۔ وہ سائنا نہیں ہے۔ وہ صاحب ہے۔ صاحب بہادر خبردار جو تم نے اسے سائنا کہا۔ ناحق بچے کو ہلکان کر رہی ہو۔ اسے گود میں اٹھا کر اپنی کوٹھڑی میں لے گئے۔ جب کہیں جا کر چپ ہوا۔

اسکی غیرتمندی زود رنجی اور تنک مزاجی کے درجہ تک (خصوصاً کم سنی میں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی مزاج میں تحمل پیدا ہوتا گیا۔) پہنچی ہوئی تھی۔ بعض وقت بزرگوں کے مقابلہ میں بے اختیار جھلا اٹھتا تھا۔ ایک دفعہ اسکول میں امتحان کا پرچہ لکھ رہا تھا۔ اور ایک کاپی بے خیالی سے ڈیسک کے اوپر رکھدی تھی ماسٹر صاحب کو جو نگرانی کر رہے تھے ممکن ہے کہ کچھ بدگمانی ہوئی ہو کہ انہوں نے قریب آکر تندی سے کہا "یہ کاپی اوپر کیوں رکھی ہے فوراً اندر رکھو" محض اس خیال سے کہ استاد نے اسکی راستبازی پر شبہ کیا وہ جوش غیرت سے بے قابو ہوگیا۔ فوراً کھڑا ہو وہ کاپی اٹھا کر انکے آگے یہ کہتے ہوئے کہ "پرچہ حساب کا ہے اور کاپی تاریخ کی۔ آپ دیکھ لیجئے" پھینکدی اس کے جھلانے پر ماسٹر صاحب بجائے غصہ کے مسکرانے لگے۔ اور یہ کہکر "کہ امتحان کے وقت کاپی باہر رکھنا خواہ وہ کسی مضمون کی ہو۔ خلاف قاعدہ ہے" چلے گئے۔ مگر اس کے بعد جب کبھی اُن کو کچھ ہدایت کرنی ہوتی تو پہلے اسکو مخاطب

ف۱ میرے نانا (مولوی محمد صادق صاحب دہلوی) نے دراز عمر پائی۔ اور بسن چھیاسی سال [illegible] میں انتقال فرمایا۔ سب بچوں سے اسقدر الفت رکھتے تھے کہ والدین کی تادیب بھی ناگوار گزرتی تھی۔

کر کے کہتے "فتح اللہ! میں امید کرتا ہوں کہ تم غصہ نہ کرو گے۔ یہ واقعہ صاحب نے خود بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ ان کے اس کہنے سے میں مارے شرم کے مرجاتا ہوں۔ واقعی اسدن ہم سے بڑی نالائقی ہوئی۔

اگرچہ بیجا گرفت پر خواہ اس کا مقابل کوئی ہو۔ وہ آپے سے باہر ہوجاتا تھا لیکن اسکے ساتھ ہی وہ اپنے تصور کا خود احساس کرتا۔ اور خود ہی اپنے آپ نہایت نادم و منفعل ہوتا تھا۔ اباجان عموماً بعد مغرب بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ صاحب بھی پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں سبق مشکل تھا یا مطالعہ نہیں کیا تھا کہ بہت اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے بس آپ لگے رونے اب اباجان پوچھ رہے ہیں کہ میرے بیٹے کا اس وقت پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے؟ نیند آرہی ہے؟ گردن ہلا دیتا ہے مگر روئے جاتا ہے۔ آخر اباجان اس کے رونے کی وجہ سمجھ گئے۔ اسے اٹھا کر اپنے زانو پر بٹھا لیا اور بڑے پیار سے سینہ سے لگا کر بولے باپ کے سامنے استاد کے سامنے آپ کو اٹک کر پڑھتے ہوئے شرم آتی ہے! اور وہ اسی طرح انکے سینہ پر سر رکھے ہوئے سو گیا۔ (کوئی آٹھ سال کی عمر ہوگی)

یہ اپنی کمی کا احساس و اعتراف ہی تھا کہ اس نے ہر امتحان میں خواہ سرکاری ہو یا آزمائشی نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن اسکو تسلی نہیں ہوتی تھی وہ ہر امتحان کے موقع پر افسردہ و دل گرفتہ ہو جاتا تھا۔ اور کم عمری میں تو اگر ایک سوال بھی چھوٹ جائے تو زار زار روتا تھا۔ جب فورتھ اسٹینڈرڈ میں تھا اور ششماہی امتحان شروع ہوا تو دوپہر کے وقت بعد امتحان گھر آیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا دیکھکر میں نے پوچھا۔ صاحب! تمہارا امتحان ہوا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ہاں ہوا۔ میں نے یہ سمجھکر کہ شاید نمبر کم ملے ہیں۔

دریافت کیا کتنے نمبر ملے؟ بہ مشکل ضبط گریہ کر کے کہا۔ نوے۔ میں نے متعجب ہو کر کہا کہ پھر تم روکیوں رہے ہو۔ کیا ہوا؟ میرا اتنا کہنا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بار بار کے اصرار پر ہچکیاں لے لیکر بیان کیا کہ آج جغرافیہ کا امتحان تھا۔ ایک ایک لڑکے سے دس دس سوال پوچھے جا رہے تھے۔ میں نے نو سوال کے نو جواب دے لیکن ایک سوال پر ذرا سوچنا پڑا۔ اسکا جواب بھی میں دیکھتا تھا۔ مگر اسوقت فوراً یاد نہیں آیا۔ دیر جو ہوئی تو ممتحن صاحب نے دوسرے لڑکے سے پوچھ لیا۔ اور مجھے نوے نمبر ہی دئے۔ میں نے کہا کہ اچھا اس لڑکے کو نوے سے زاید نمبر ملے؟ بولا نہیں نوے نمبر بھی کسی کو نہیں ملے میرے ہی نمبر سب سے زیادہ ہیں۔ ممتحن صاحب نے مجھے ویری گڈ بھی دیا۔ ہم بھائی بہن یہ باتیں کر رہے تھے جو اماں جان ادھر آ گئیں۔ یہ حال سنکر خوب ہنسیں کہ واہ رے دیوانے بچے! نوے نمبر لیکر رو رہا ہے۔ بیٹے یہ اعزازی مارکس ہیں۔ تم تو درجۂ آنرمیں پاس ہوئے۔ اگر ساٹھ فیصد نمبر مل جائیں تو بس ٹھیک ہے۔ ادھر نواب نے چھیڑنا شروع کیا کہ واہ جناب واہ! آپ نے نوے نمبر ہی لئے۔ اگر سو میں ڈیڑھ سو لیتے تو جب آپکا کمال تھا۔ اماں جان نے ٹھنڈا پانی منگوا کر منہ ہاتھ دھلایا۔ بڑی دیر کے بعد کہیں آنسو تھمے۔ غرض اسیطرح ہمیشہ اسکی غیرتمندی کے مظاہرے ہوا کرتے تھے۔

اس کی شانِ غیوری ایک یہ بھی تھی کہ کسی سے مدد کی خواستگاری نہ کرتا۔ بلکہ اپنی احتیاج کا اظہار بھی نہ ہونے دیتا تھا حتی کہ ماں اور بڑی بہنوں پر اپنی ناسازی مزاج کا حال تک ظاہر کرنے سے گریز کرتا تھا۔

جب طبیعت کچھ خراب ہوتی تو اوڑھ لپیٹ کر خاموش لیٹ جاتا اور کسی کو اطلاع نہ دیتا۔ صرف صورت حال سے دریافت کرکے خود اسکی ضروریات کا خیال کرتے تو دل میں بیحد ممنون ہوتا۔ اور آنکھوں سے اظہار تشکر کرتا تھا۔ لیکن کوشش یہی ہوتی کہ بھائی بہنوں سے بھی کسی قسم کی کوئی امداد نہ لے۔ صاحب! تو فی الواقع غیور تھا۔ ہائے تیری غیرتمندی نے گوارا نہ کیا کہ مرض الموت میں بھی غریب و ناقابل بہنوں پر اپنی تیمارداری اور اخراجات کا بار ڈالے۔ آہ اپنے سفر آخرت کا خرچ خود ہی مہیا کر لیا۔ اور کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا۔ کم سے کم زمانہ نے تیری یہ خواہش تو پوری کردی۔

راستی ۔ صاحب نہایت راست گو۔ راستباز اور راستی پسند تھا۔ اس کا قول مطابق فعل اور ظاہر و باطن بالکل یکساں تھا جس میں تصنع نمود و نمایش۔ مکر و ریا۔ فریب و نفاق کا شائبہ بھی نہ ہوتا اسکی گفتار و کردار اوضاع و اطوار۔ خیالات و جذبات۔ محاسن و معائب بالکلیہ صدق و خلوص پر مبنی تھے۔ اسکا چہرہ گویا دل کا آئینہ تھا کہ محبت و نفرت۔ پسندیدگی و ناپسندیدگی کا فوری اظہار ہو جاتا۔ وہ نہ صرف زبان کا سچا تھا بلکہ دل کا بھی سچا تھا۔ نہ کسی سے ایسا وعدہ کرتا جسکو ایفاء نہ کر سکے۔ اور نہ کسی کو خوش کرنے کے لئے اپنے ضمیر کے خلاف ہاں میں ہاں ملاتا۔ اگر کوئی اس سے دریافت کرتا تو وہ بغیر اندیشہ اپنی رائے کا اظہار کر دیتا۔ اور اگر کوئی اسکی غلطی جتا کر نیک مشورہ دیتا تو بلا تامل قبول کر لیتا۔ باوجود مستقل الرائے اور خود اعتماد ہونے کے اس میں خودرائی اور استبداد مطلق نہ تھا۔ جہاں اپنی بات بے اثر دیکھتا خاموشی اختیار کر لیتا تھا۔

انکسار و تواضع۔ وہ غرور و تکبر۔ خود ستائی و لاف زنی سے بالکل مبرا تھا۔ انانیت و نفسانیت اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی کسی موقع پر کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکلتا تھا جس سے غرور کی بو بھی آئے۔ وہ اپنی شاندار کامیابیوں کی خوشخبری ایسی ندامت و انفعال کے ساتھ سناتا۔ جیسے کوئی فیل ہونیکی خبر دے۔ وہ گھر کا کام کرنے میں کسر شان نہیں سمجھتا تھا۔ تا بامکان اپنا کام آپ کر لیتا۔ اور کسی کو تکلیف نہ دیتا تھا۔ اب آنریری منصف ہونیکے بعد) اپنی میز آپ صاف کر لیتا۔ بوٹ کو پالش خود لگا لیتا۔ کوئی دوست آجائے تو کرسیاں پانی کی صراحی وغیرہ خود اٹھا کر لیجاتا تھا۔ بزرگوں کے ساتھ ادب و تعظیم۔ دوستوں سے مروت و اخلاق۔ چھوٹوں سے شفقت و محبت اور ملازمین کے ساتھ نرمی و مہربانی سے پیش آتا۔ اسی لیے سب بلا عذر و حیلہ اسکے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ اور خوشی خوشی اسکا کام انجام دیتے تھے۔

صبر و استقلال کیسی ہی سخت تکلیف ہو وہ نہایت ضبط و تحمل کے ساتھ برداشت کر لیتا۔ علالت کی حالت میں (سوائے عالم شیر خواری کے) اس نے کسی کو نہیں ستایا۔ نہ کبھی دوا پینے کے لئے ضد کی۔ نہ پرہیز کرنے کیلئے جس وقت اسے ملیریا بخار شروع ہوا ہے (کم سن ہی تھا) ڈاکٹر کی رائے کے بموجب کئی کئی دن تک متواتر صرف دودھ اور ساگو دیا جاتا تھا۔ مگر وہ نیک بخت یہ بھی نہ کہتا کہ فقط ساگو پیتے پیتے میرا جی بیزار ہو گیا پھیکی سیٹھی غذائیں کڑوی بد مزہ دوائیں بغیر منہ بنائے چپ چاپ پی لیتا۔

بارہ تیرہ سال کی عمر میں زرنڈیلسی اسکول میں پیرلل بار پر سے گرنے سے اس کے بھینچے کی ایک دم دو ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں جب

اسکول سے گھر لائے ہیں۔ تو شدت کرب سے چہرہ کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔ مگر خاموش۔ اسدن تمام رات اسی سے چلتی رہی کہ ایک منٹ کیلئے آنکھ نہیں جھپکی لیکن منہ سے اف تک نہ نکالی۔ (مہینہ بھر میں ہاتھ اچھا ہوا) تاہم وہ خلقتاً نازک مزاج تھا۔ اگرچہ ہمت کرکے سختی جھیلنے کی کوشش کرتا مگر برداشت نہ کرسکتا۔ طبیعت بدمزہ ہو جاتی۔ خصوصاً گرمی اسکی دشمن تھی۔ بچپن میں جہاں ذرا دھوپ میں پھرتا فوراً سر میں درد ہونے لگتا اور بعض وقت بخار کی حرارت بھی ہو جاتی تھی۔

نرم دلی و محبت۔ وہ نرم طبیعت اور رحمدل واقع ہوا تھا۔ خدا تعالیٰ نے اسے ایک محبت بھرا دل عنایت کیا تھا۔ اسکو اپنے عزیز و اقارب سے حد درجہ کی انسیت تھی باوجودیکہ خود ہر طرح کی تکلیف نہایت صبر کے ساتھ جھیلتا تھا لیکن دوسروں کے درد و مصیبت کو دیکھکر بیقرار ہو جاتا تھا۔ عزیز تو عزیز غیروں بلکہ جانوروں کی تکلیف تک اسے متاثر کر دیتی تھی۔ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس پر اسکا عمل تھا۔ بیماروں کی عیادت کرتا۔ مردوں کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتا۔ پسماندوں کو تسلی و تشفی دیتا۔ بہرحال ہر ممکنہ تدبیر سے درد رسیدہ کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کرتا۔

ہمدردی و امداد۔ قدرت نے ہمدردی و مددرسانی کا مادہ اسمیں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ گھر میں جسکو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو وہ ہمہ تن موجود۔ کوئی بیمار پڑے وہ تیمارداری کے لیئے حاضر۔ دوپہر کا وقت ہو یا آدھی رات کا ڈاکٹروں کے پاس جانے دوائیں لانے کے واسطے مستعد۔ کوئی کام آپڑے وہ بغیر کہے حصہ لینے کیلئے تیار خواہ گھر کا کام ہو یا مدرسہ کا

اگر گھر کے کاروبار میں مدد دیتا تو مدرسہ کی مشکلات میں ہاتھ بٹاتا۔ خاصکر
امتحان کے موقعوں پر جب کام کی کثرت سے میں اور رابعہ پراگندہ حواس
ہوجاتے تو پرچے چھاپ کر دیتا۔ تصحیح کرنے میں مدد[1] دیتا۔ اسی طرح گھر کا ایک
فرد اس سے اپنے کام میں مدد لیتا اور وہ بلا انکار سب کو مدد دیتا۔ کسی کو
فارسی پڑھا رہا ہے۔ تو کسی کو حساب بتا رہا ہے کسی کو گرامر سمجھا رہا ہے
تو کسی کو انگریزی کا مشق کرا رہا ہے۔ کہیں تعلیمی امور میں دلچسپی لے رہا ہے
تو کہیں خانگی معاملات کا انصرام کر رہا ہے۔ غرض اتنی سی عمر میں اپنی
ذات سے خاندان کو سخنے۔ قلمے۔ قدمے۔ درمے۔ جسقدر فیض پہنچا سکتے تھے
بلا دریغ[2] پہنچا دیا۔

ہر دلعزیزی ۔ یوں تو صاحب کو لڑکپن ہی سے اپنے خاندان میں
ایک خاص ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ اور دنیا میں کون شخص ایسا ہے جسکے
ماں باپ۔ بھائی۔ بہن۔ عزیز و قریب اس سے محبت نہ رکھتے ہوں
لیکن ہمارے ہاں صاحب کو محبوبیت نہیں بلکہ درجۂ معشوقیت
حاصل تھا کہ سب سے زیادہ اس سے محبت کرتے تھے۔ اماں
سب بچوں سے زایدا سکو چاہتی تھیں۔ اور اگر کوئی انکی خصوصیت
پر گرفت کرتا تو جواب دیتیں کہ "یہ میرا مصیبتوں کا پالا ہوا بچہ ہے
اس کے لئے دو سال تک راتوں کی نیند مجھ پر حرام رہی ہے۔ جتنا
اس نے مجھے ستایا اور رلایا ہے اتنا اور کسی بچے نے نہیں ستایا"

---

[1] خصوصاً جب سے میں بیمار ہوئی۔ اسکول کے امتحان کا کام تنہا انجام نہیں دیسکتی تھی تو امتحان کے
موقعوں پر سیول سروس بورڈنگ سے اپنی تعلیم کا حرج کرکے مجھے مدد دینے کیلئے آیا کرتا تھا۔

[2] اس کے ایک قطعہ کے شعر ہیں کتنے پژمردہ ہیں غنچے چمنستاں کے مرے + کھلکھلا دوں میں بنسیں
باد صبا ہو جاؤں۔ بزم ماتم میں ہیں پیغام مسرت لاؤں۔ غم کو مفقود کروں دہ دریا ہو جاؤں۔

اس کی ذراسی تکلیف سے بے چین ہو جاتیں اور اسکے آرام کا سب بچوں سے بڑھکر خیال رکھتیں۔ اگر اماں جان کی چاہت کا سبب اسکی نازک مزاجی تھی تو اباجان اس کے اوصاف کے قدرشناس تھے ہمیشہ کہتے کہ میرا شریف میاں ہے۔ اگر وہی قصور دوسرا بچہ کرتا تو خفا ہوتے۔ اور اگر وہی خطا صاحب سے سرزد ہو جاتی تو مسکرا کر چپ ہو جاتے۔ اس کے غصہ اور تیز مزاجی (بچپن میں بہت جھلا اور تیز مزاج تھا۔) پر بجائے برہم ہونیکے ہنس پڑتے۔ بلکہ خود الٹے تالیف قلب کرتے۔ کسی وقت انکی حد سے زیادہ درگذر پر اماں جان اعتراض کرتیں تو فرماتے۔ کیا کروں۔ اس لڑکے پر میرا ہاتھ نہیں اٹھتا۔ کبھی کہتے۔ "میرا صاحب اسپ تازی ہے۔ تاب مہمیز ہم نمی آرد تا بہ قمچی چہ رسد"

شعور کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس کے محاسن اخلاق نمایاں ہونے لگے اسکی مقبولیت و محبوبیت بڑھتی گئی گھر کا ہر ایک فرد اس پر فدا تھا۔ بڑا بھائی اسکا پروانہ اور چھوٹا اسکا دیوانہ تھا۔ اور بہنیں بدنصیب و سیہ بخت بہنیں تو اسکی صورت دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ آہ۔ تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا والدین کے دوست احباب عزیز و قریب سب اسکو از حد عزیز رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف اہل خاندان اور حلقۂ احباب میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا بلکہ کم طبقہ کے لوگ نوکر چاکر خدمتی وغیرہ بھی اسکے گرویدہ تھے نوکروں کے بچے تک اسکو "میرے میاں" کہا کرتے تھے۔ اگر سب صاحب پر فریفتہ تھے تو اسکی وجہ محض اسکی ذاتی خوبیاں تھیں اسکی نیکوکاری۔ شریف النفسی۔ محبت و ہمدردی۔ امداد و اعانت۔

ف[1] صاحب کی مختصر و جامع تعریف بتانا ہے کہ وہ شریف تھا۔

ادب و اطاعت اور سب سے بڑھکر اس کا حسن سلوک ہر کہ ومہ کو مجبور کرتا تھا کہ اسکو اپنے خانۂ دل میں جگہ دے۔

خوش مذاقی و موزونیٔ طبع - صاحب نہایت ظریف، خوش طبع، لطیفہ سنج اور بذلہ گو تھا۔ اس کا مذاق نمکین و بامزہ ہوتا تھا۔ ایسے برجستہ و برمحل فقرے استعمال کرتا کہ سب پھڑک اٹھتے حبیبہ کی شادی ۶ راپریل کو ہوئی۔ رات کو اندر کمرہ میں بیٹھنے سے دولھا دلھن کو سخت گرمی معلوم ہوتی تھی۔ میں اس خیال سے کہ صحن میں ایک طرف پردے گھیر کر ان کے لئے جگہ بنادی جائے بانس گاڑ رہی تھی کہ صاحب آگیا اور میرے ہاتھ سے بانس لیکر خود لگانے لگا۔ پردہ باندھتے باندھتے دل لگی سوجھی۔ بہنوئی کو پکار کر بولا۔ "حبیب دولھا، ہم تنکے چنتے ہیں تمہارے آشیانے کیلئے"۔

خالہ جان نے عثمانیہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے جو "تیموریہ اسکالرشپ" مقرر کیا تو ان کے کئی رشتہ داروں نے وہ وظیفہ حاصل کرنا چاہا۔ لیکن مرزا جواں بخت نامزد کئے گئے۔ خالہ جان نے اسکا ذکر صاحب سے کیا تو آپ مسکرا کر کہنے لگے۔ یہ کہئے۔ "سہرا جواں بخت ہی کے سر رہا"۔

وہ صرف ظریف الطبع ہی نہیں بلکہ فطرت نے اس میں ملکہ شاعری بھی ودیعت کیا تھا جو کچھ کہتا فی البدیہہ کہتا تھا۔ اسکی موزونیٔ طبع اور بدیہہ گوئی کی جھلک عالم طفولیت ہی میں نظر آنے لگی تھی۔ اباجان اکثر بچوں سے بیت بازی کروایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب اسکو (صاحب اُس وقت آٹھ نو سال کا ہوگا) مشکل مشکل ردیفیں دیکر دق کر رہا تھا۔ بالآخر ردیف ٹ دی۔ صاحب سوچنے لگا۔ شاید کوئی شعر یاد نہیں آیا۔

ادھر نواب نے تقاضا شروع کیا "یا تو جلد جواب دو یا ہار مانو" یکایک جیسے دماغ میں روشنی پڑی چمک کر کھڑا ہو گیا کہ نہیں مانتے جی ہار۔ یہ لو لوٹی لوٹی پہ لڑتے ہیں بنئے ۔ کوڑ کوڑی پہ ہوتی ہے کھٹ پٹ" شعر کے مضمون اور پڑھنے کے انداز پر سارا گھر ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ ابا جان نے (جو بیٹھے سن رہے تھے) تالی بجائی کہ فتح فتح صاحب کی فتح۔

ایک دن اماں جان نے اسے کسی کام کو خالہ جان کے گھر بھیجا تھا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو انکے بھائی مکان کے فرش کیلئے چینی کے ٹوٹے ہوئے برتن جمع کرنیکی کسی کو ہدایت کر رہے تھے۔ صاحب کو دیکھکر کہا "آئیے جناب بیرسٹر[ف] صاحب! ذرا اس مصرعہ پر مصرعہ تو لگائیے پڑے پاؤں آگر چینی کے برتن۔ اس نے جھٹ جواب دیا تو بس انکو اٹھا ہی لینا فوراً۔

طاہرہ کو ہمیشہ سے بلیوں کے پالنے کا شوق ہے۔ انہوں نے اپنی ایک بلی کا نام دردانہ رکھا تھا۔ اور بہت چاہتی تھیں صاحب انہیں یہ کہہ کہکر ستایا کرتا کہ دردانہ مرجانہ۔ مرجانہ مرجانا۔ اسی زمانہ میں ایک نظم بعنوان "بیگم آپا کی بلی" لکھی تھی۔ دس بارہ شعر تھے۔ اب صرف تین شعر ہی یاد آرہے ہیں۔

ایک بلی سفید ہے چھوٹی ۔۔۔ جو کہ بیٹی ہے بیگم آپا کی
نام اسکا رکھا ہے دردانہ ۔۔۔ جسکو کہتے ہیں لوگ مرجانہ (یا مرجانا)
روز جو ہے پکڑتی ہے وہ در ۔۔۔ لا[ف] کے دیتی ہے بیگم آپا کو

خالہ جان اسکے بچپن کی ظریفانہ تک بندیاں (جسمیں واقعیت کا عنصر موجود ہوتا تھا)

ف اماں جان کو جب خالہ جان کے پاس کچھ کہلا بھیجنا ہوتا تو اکثر صاحب ہی کو بھیجا کرتی تھیں چونکہ نہایت معقولیت سے گفتگو کرتا تھا اس پر ان کے چھوٹے بھائی (مرزا قمر الدین حیدر صاحب مرحوم) انہیں بیرسٹر پکارتے اور اسکے ساتھ ہمیشہ ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔

ف یہ واقعہ ہے یعنی چوہا پکڑ کر طاہرہ کے پاس آئی تھی۔

سنکر اماں جان سے کہا کرتی تھیں۔ کہ بہن! آپ کا یہ بچہ نیچرل شاعر ہے
یہ جو کہتا ہے۔ حالیہ کہتا ہے

سخن سنج نکتہ رس بزرگوں کی یہ پیشین گوئیاں بڑی حد تک پوری ہوئیں اور عمر کے ساتھ ساتھ اسکا یہ جوہر بھی نمودار ہوتا گیا۔ مگر تعلیمی ناموری حاصل کرنیکی دھن میں وہ کبھی شاعری میں مشغول و منہمک نہیں رہا۔ تاہم اسکی طبیعت میں آمد بہت تھی کہ باوجود نو مشقی و عدم التفات کے اسکا کلام جسقدر موجود ہے۔ بغایت لطیف و دلکش ہے۔ جسے دیکھکر سر دھنتی ہونگی۔ ہائے عمر ہی نے وفا نہ کی ورنہ یہ چشمہ آگے چلکر ایک دریا کے امواج کی صورت اختیار کر لیتا۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

جذبات پر قدرت اور سلامت روی۔ اسکو اپنے جذبات پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ وہ ہر ایک سے بہ خلق و مروت پیش آتا۔ بقدر احتیاج و امکان سبکو مدد دیتا۔ لیکن کوئی شخص اس پر حاوی نہ ہو سکتا تھا وہ سب کچھ کرتا۔ سینما دیکھتا۔ شطرنج تاش وغیرہ کھیلتا۔ دل لگی مذاق کرتا۔ دوست احباب سے ملتا جلتا۔ لیکن کوئی چیز اس کو فرض منصبی سے باز نہ رکھ سکتی تھی سب سے ملا جلا پھر سب سے الگ تھلگ نہ خود حد سے آگے بڑھتا اور نہ کسی کو حد سے بڑھنے دیتا۔ اگر چھوٹے اس کا ادب کرتے تو بڑے اسکا لحاظ۔ کم سن بچوں سے خاص طور پر انسیت تھی۔ ہمیشہ انکے ساتھ کھیلتا کودتا بلکہ کشتم کشتی کرتا رہتا تھا۔ مگر مجال نہیں کہ کوئی بے موقع اس سے گستاخی کرنے پائے۔ اس کی تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے کہ بدتمیز بچوں کے ساتھ اچھل کود کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ سفید ریش بوڑھے اسکی

وقعت وتوقیر کرتے نظر آتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں خدا نے اسے کیسی صلاحیت طبع عطا فرمائی تھی۔ خالہ جان اکثر اسکی نسبت فرمایا کرتی تھیں "اس لڑکے نے عجب سموئی ہوئی طبیعت پائی ہے۔" واقعی خلاق عالم نے متضاد صفتیں اسکی ذات میں بدرجۂ اعتدال جمع کر دی تھیں۔

وہ بلند ہمت قانع۔ خوددار۔ متواضع۔ غیور۔ منکسر۔ بلند نظر کفایت شعار۔ عالی ظرف خردہ گیر۔ قدامت پسند روشن خیال۔ رحمدل انصاف پسند۔ پابند مذہب۔ آزاد خیال۔ ذہین محنتی۔ محتاط مستغنی۔ نفس کش ہمدرد۔ تیز مزاج مودب۔ باوقار ظریف۔ خوش طبع الم پرست نازک مزاج متحمل۔ نرم دل مستقل۔ بامروت بے میل راستباز ہردلعزیز بے غرض دوست اور بے آزار دشمن تھا۔

ہائے ماموں جان کا یہہ کہنا میرے دل پر نقش ہے۔ "چونکہ عمر کم لائے تھے۔ اور وہ مدارج حاصل کرنے تھے جو دوسرے پچاس ساٹھ سال میں حاصل کرتے ہیں۔ اسلئے کم مدت میں تمام امور کی تکمیل کر لی۔"

اے کاش وہ بدطینت بدسرشت ہوتا۔ بیدرد بے احساس ہوتا۔ بے علم جاہل رہتا۔ آوارہ ننگ خاندان نکلتا۔ بلا سے جیتا رہتا۔ جب جی جلتا برا بھلا کہتے لعنت ملامت کرتے۔ اس سے بھی بڑھکر کوستے کاٹتے۔ لیکن ہائے یہ آگ تو دل میں نہ لگتی۔

میں اس سے اکثر کہا کرتی تھی۔ جانی! خدا تجھے بہت عروج پر پہنچائیگا۔ کیونکہ تو ہمیشہ دردمند دلوں کی دعا لیتا ہے۔ عزیز واقربا۔ دوست

ف۔ مولوی سید حسن صاحب مصنف جو میری والدہ کے پھوپی زاد بھائی ہیں۔

احباب۔ اعلیٰ ادنیٰ ہر ایک کی زبان سے یہی نکلتا کہ خدا اسکی عمر میں برکت دے۔ اللہ صاحب نصیب کرے۔ خدا اسکے دل کی مرادیں برلائے۔ رات دن بیسوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے۔ آدھی رات ہو یا پچھلا پہر جب آنکھ کھلتی دل سے یہی دعا نکلتی کہ صاحب! جیسے تو ہمارے دلوں کو خوش رکھتا ہے خداوند کریم تجھے شاد کام و بامراد رکھے۔ ہائے ہائے! تمام دعائیں اس کے حق میں بد دعائیں بن گئیں۔ وہ تو اسطرح دنیا سے گیا جیسے کسی جلے دل کا کوسا لگ جاتا ہے کہ ارے تو ناشاد و نامراد دنیا سے جائے۔ تجھے جوانی کا سکھ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ تجھے اڑھائی گھڑی کی موت آئے۔ ظالم کی عمر کوتاہ غرور کا سر نیچا۔ میرے اللہ اس کیلئے دنیا کے تمام اصول الٹے۔ بزرگوں کے سب مقولے غلط ہوگئے۔

ہائے وہ تو ابھی اسٹیج عمل پر نمودار بھی نہ ہوا تھا۔ کہ اسکی خوبیاں عالم آشکارا ہوتیں۔ وہ تو وہ موتی تھا جو ابھی صدف ہی میں رہے کہ زمانہ اسکی قدر و قیمت سے واقف ہوتا۔ صاحب جیسے بھائی کو صبر کرنا سخت سنگدلی ہے۔ ہائے! کیسا بھائی اولی صفت فرشتہ خصال بھائی! مونس و غمگسار بھائی! ممتاز و ذی وقار بھائی! یا اللہ کیسا گوہر گرانمایہ ہاتھ سے گیا۔ ترشا ہوا ہیرا گل سر سبد آہ! اس نعمت عظمیٰ سے ہمیشہ ہمیشہ کی محرومی پر حرمان نصیب اہل خاندان اگر مجنوں ہو جاتے۔ ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑ ڈالتے۔ سینہ چاک کر ڈالتے۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیتے۔ تب بھی کم تھا!

این چہ استغنا است یارب وین چہ جابر حاکمست
کیں ہمہ درد نہان است و مجال آہ نیست

ترک ما سوے کس نمی نگرد ٭ آہ ازیں کبر باد جاہ و جلال

سول سروس ہوم سے واپسی

راستی خاتم فیروزہ بو اسحاق ٭ خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود
دیدی آں قہقہ کبک خراماں حافظ ٭ کہ ز سرپنجہ شاہین قضا غافل بود

یکم اگست سنہ ۱۹۲۹ء بروز پنجشنبہ گھر واپس ہوئے ہمیں ایکدن پہلے ہی نتیجہ کی اطلاع مل چکی تھی اور یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ آج صاحب گھر آنے والے ہیں۔ نہایت بےچینی کے ساتھ دو پہر سے انتظار ہو رہا تھا۔ آخر قریب مغرب گاڑی دروازے پر پہنچی اور اس کے اترنے سے پہلے ہی سب کے سب آنگن میں دوڑے۔ خالہ جان بھی اپنا پھولوں کا ہار لئے ہوئے اٹھیں اور سب سے پہلے انہوں نے یہ کہکر گلے میں ڈالدیا کہ "ایک چمن کے گلے کا ہار ہے خدا تم کو بھی میری عمر تک پہنچائے اور سعادت حج سے بہرہ مند کرے"۔ لیکن صاحب بجائے اسکے کہ خوش و خرم آتے گھر میں داخل ہوئے تو نہایت غمگین۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ میں نے خیال کیا یا تو یہ خوشی کے آنسو ہیں یا والدین کی یاد اس کو رلا رہی ہے۔ خود میرے دل کی اسوقت عجب حالت تھی بے ساختہ یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشہ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

اس کے رونے سے سب آبدیدہ ہو گئے اور وہ سب سے مل ملا اندر کمرہ کے جا ایک کونہ میں بیٹھکر زار و قطار رونے لگا۔

اتنے میں بہن نور النسا بیگم کے ہاں سے (اپنا ادمی ہمارے پھاٹک پر بٹھا رکھا تھا کہ صاحب کے آتے ہی اطلاع دے) پھول وغیرہ آ گئے اور سب کا خیال ادھر بٹ گیا۔ دوسرے دن حبیبہ اور بہن قطب النسا بیگم نے (انکی والدہ امان جان کی عزیز ترین دوست تھیں) بڑی دھوم دھام سے گل پوشی کی طیاری کی۔ ان کے علاوہ اور کئی دوستوں عزیزوں نے بھی پھول پہنائے دعوتیں کیں۔ بڑی خوشیاں منائیں پہلے دن پھول پہنا کر جب مجھ سے آ کر ملا تو مذاقیہ پوچھا کہ "اجی حضرت! آپ کب پھول پہنائینگی؟" میں نے جواب دیا "انشاء اللہ ہم تمہاری شادی کے پھول پہنائینگے"۔

نہ دلھن دیکھی نہ بنتے اسے دولھا دیکھا ٭ کیا تمنا تھی مجھے ہائے غضب کیا دیکھا

آئی سی۔ ایس میں انتخاب ہوتے ہی پیغاموں کی بوچھار ہو گئی تھی۔ جو آتا نسبت کا ایک شگوفہ چھوڑتا۔ جو ملتا ایک لڑکی کا تذکرہ چھیڑتا کوئی کہتا کہ پچاس ہزار کی شادی کرینگے۔ کوئی کہتا کہ پچیس ہزار کی جائداد لڑکی کے نام پر لکھنے کیلئے تیار ہیں۔ خود میرا خیال بھی دو تین لڑکیوں کی طرف تھا۔ واپسی کے بعد میں نے ایک دن کہا کہ "صاحب! اگر تمہاری مرضی ہو تو کچھ سلسلہ جنبانی کیجائے"۔ تو بولا۔ نہیں آپا جان! ابھی قبل از وقت ہے حبیبہ کی شادی کا قرض ہی ابھی ادا نہیں ہوا ہے۔ پھر بھائی جان کی شادی کا معاملہ درپیش ہے"۔ اس پر میں نے کہا ہم بات ٹھیرا دینگے شادی بعد میں کرنا"۔ تو کہا کہ میری تو رائے یہ ہے کہ جب تک سب باتوں سے یکسوئی نہ ہو جائے آپ اس معاملہ کو چھیڑیں ہی نہیں۔ پھر دیکھا جائیگا"۔

ف والدہ کے انتقال کے بعد ان کے پوسٹ پر نور النسا بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ کا تقرر ہوا تھا جبھی سے باہم ربط و ارتباط و موانست قائم ہے۔ اور شاید حقیقی بہنوں (اسکے علاوہ) اشک بہا ہوں۔

سبک بار مردم سبک تر روند۔

ہر دل از کار جہاں ہیچ نہ بودت بارے
بارے از کار جہاں خوش دل و خرم رفتی

ابھی تک تو طالب علمی۔ بے اختیاری کا زمانہ تھا۔ لیکن اب با اختیار صاحب معاش ہو کر گھر آئے تھے۔ اگرچہ اس کی اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلگی سے اس کی توقع تو نہ تھی تاہم کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا کہ آخر انسان ہے شاید اب اس کے مزاج میں کچھ تغیر پیدا ہو۔ اقتدار حاصل کرکے بڑے بڑے بہک جاتے ہیں اسکی تو کچی عمر ہے۔ مگر وہ بہ مصداق ع نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں۔ پہلے سے بھی زیادہ منکسر۔ متواضع۔ خلیق۔ خوش طبع۔ نیک۔ ہمدرد و غمگسار ہو کر آیا۔ اب تک تو ان کی ڈیوٹی گویا تکمیل تعلیم تھی۔ (گھر کے معاملات میں بے کہے بہت کم دخل دیتا تھا) مگر اب آتے ہی گھر کے ہر ایک بار کا از خود ذمہ لے لیا۔ ادھر بڑے بھائی کی شادی کی فکر۔ ادھر چھوٹے بھائی کی تعلیم کا خیال۔ ادھر گھر کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں پر نظر۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس بے وارثے گھر کا وارث پیدا ہو گیا ہے۔ اسکا یہ مقصد تھا۔ (زبان سے نہیں بلکہ عمل سے) کہ بس بہنوں نے اپنا حق ادا کر دیا اب ہم کو ان کا حق ادا کرنا چاہئے۔

تنخواہ ملی تو پہلے امی کو لا کر دی۔ انہوں نے سیکڑوں دعائیں دیکر کہا اللہ عمر دے۔ تندرستی عطا کرے۔ ہزاروں کمانا اور کھلانا نصیب کرے واپس دیدی۔ پھر طاہرہ کے پاس لیگیا کہ بیگم آپا! حقیقی معنوں میں تو اسکی مالک آپ ہیں۔ انہوں نے ہنسکر کہا۔ خوب!

محنت کسی کی اور مالک کوئی! بولا "میں آپکا خاص بھائی ہوں نہ"! طاہر کی دلجوئی کا بڑا خیال تھا۔ اکثر مجھ سے کہتا کہ بیگم آپا کے واسطے میرا دل بہت دکھتا ہے۔ آپ نے نوں کا کیا ہے پنشن لیکر جہاں بھی جائیں جائیں سیر ہیں۔ مگر بیچاری بیگم آپا بالکل بے سہارا ہیں اور ان کو اسکا احساس بھی بہت ہے۔

ایک دن میں مدرسے سے آکر لیٹ گئی تھی شاید چہرہ متغیر دیکھکر پوچھا "اپی! جی کیسا ہے؟ میں نے کہا "کچھ نہیں جانی! اب میں تھک بہت جاتی ہوں" پاس بیٹھکر میرا ہاتھ اٹھاکر اپنے سینے پر رکھ لیا اور بڑے اثر سے بولا "آپا جانی! اب آپ پنشن کی درخواست دیدیجئے۔ بس ہم آپ کو بہت پیس چکے۔ آپکے ساتھ بہت خودغرضی برتی۔ اب کام کروانا درحقیقت آپ پر ظلم ہے! میری تو رائے یہ ہے کہ اب آپ آرام لیں۔ آہ۔ آہ!

تیرے دل میں جب نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

می خورم خون جگر بے تو مرا پرس گہے۔
کہ دریں خوردن خوناب چہ حالت ترا
نیز آں ہمی جوئی غمی پرسی نمی دانی
چرا ازآشنایاں این چنیں کس بے خبر باشد

دل کا کھٹکا

تھی خلش جس کی ایک مدت سے
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

اماں جان کہتی تھیں کہ صاحب کی ولادت سے پیشتر ایک دن ابا جان نے ان سے کہا کہ "معلوم ہوتا ہے اب کے بھی تمہیں لڑکا ہوگا اور جوان مریگا۔ اور جب وہ اس پر برہم ہوئیں کہ کیوں فال بدزبان سے نکالی تو ہنسکر کہنے لگے "میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک جوان شخص جوان معلوم ہوتا ہے ہمارے گھر میں آیا ہے اور اس بے تکلفی سے پھر رہا ہے گویا اسی کا مکان ہے۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ لڑکا ہوگا اور شاید جوانی کی عمر تک پہنچے۔ خدا کرے کہ یہ تعبیر غلط ثابت ہو" خیر اس وقت کی بات تو ہنسی اور غصہ میں اڑ گئی مگر کھٹک دونوں دلوں میں تا زیست باقی رہی۔

ایک دفعہ ابا جان نے مجھ سے بھی (ورنگل میں) اپنا یہ خواب بیان کیا تھا اور کہتے کہتے اسقدر لرز کر دعا کی کہ خداوندا! تو میرے دل کو اس داغ سے بچا! بدنصیب ہیں وہ والدین جنکو جوان اولاد کا داغ دیکھنا نصیب ہو" کہ اب تک میرے دل پر ابا جان کے اس کہنے کا اثر باقی ہے۔ اس واقعہ کے کوئی مہینہ بھر بعد ہی دفعتاً

ابا جان کی عادت تھی کہ اکثر اس قسم کی باتیں بے دھڑک کہ بیٹھتے تھے۔ میری منجھلی بہن کی نسبت بھی (جنکا انتقال بہ عالم صغر سنی صاحب کی ولادت سے پیشتر ہوا) فرمایا کرتے تھے "یہ لڑکی

انتقال فرما گئے۔ مستجاب الدعوات تھے خدا نے انکی دعا قبول کرلی۔

جب گیارہ بارہ سال کی عمر میں صاحب پر ملیریا کے حملے ہونے شروع ہوے تو اماں جان کے دل میں یہ خوف پیدا ہو گیا کہ آگے چلکر اسکو مرض دق نہ ہو جائے۔ ایک تو یہ لڑکا ہے نحیف الجثہ پھر طبیعت بھی اس قسم کی پائی ہے محرور المزاج (دونوں معنوں میں) غیر ممتند آن پر جان دینے والا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملیریا تپ کہنہ پڑ ڈالدے اسی اندیشے سے جب صاحب کو بخار آتا تو گھنٹوں زار و قطار روتیں۔

والدین خوش قسمت تھے کہ انہوں نے یہ داغ نہ دیکھا آہ! یہ صدمہ تو ہمارے حصہ میں آیا تھا۔

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا
غم ہم کو دیا سب میں جو مشکل نظر آیا

خدا جانے والدین کے خیالات کا اثر تھا یا ہونے والی بات کہ (کہتے ہیں دلوں کو پہلے سے خبر ہو جاتی ہے) صاحب کے آئی۔ سی ایس میں اول ہونے کے بعد سے ہم تینوں بہنوں کے دل میں ایک نیا ہول سما گیا تھا۔ کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے" مارے وہم کے اسکی کامیابی کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے۔ تذکرہ بھی کرتے تو سرسری۔ اگر کوئی ملازمت کے بارے میں دریافت کرتا تو ٹالدیتے کہ نہیں ابھی ملازمت تو نہیں ملی ہے سال بھر کے بعد ملیگی" مگر ع

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا۔

اخباروں کے ذریعہ لوگوں کو اطلاعیں ملیں۔ اب جو ملتا ہے مبارکباد دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اب تمہاری بدقسمتی دور ہو گئی۔ کوئی کہتا ہے

کہ اچھے دن آئے غم کا زمانہ گیا اب خوشی ہی خوشی ہے۔ صاحب کیلئے
ہزار پر پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کوئی گاڑی خریدنے کی صلاح دیتا
کوئی مکان بنانے کی اور یہاں ہے کہ کلیجہ پر تیر لگ رہے ہیں۔ ہائے!
یہ سب کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں ؎ وا

مخفی بہت کیا یہ اجل پاگئی نہیں ہے ہے منافقوں کی نظر کھا گئی نہیں

حبیبہ کے پھول پہنانے کے بعد بھائی بہنوئی سب بیٹھے ہیں
ہنسی دلگی ہو رہی ہے اور دولھا دولھا" کہکر اسے چھیڑ رہے ہیں۔
ایک طرف گراموفون بج رہا ہے اور میں ایک طرف (اسدن طبیعت
اچھی نہیں تھی۔) پلنگ پر پڑی ہوئی ہوں۔ ایکدم میرے دل میں آگیا ع

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

اور اس خیال کے ساتھ ہی میں ایک جھرجھری لیکر اٹھ بیٹھی کہ نہیں
یوں ہونا چاہیے۔ "جہاں ماتم ہوتے ہیں وہاں نقارے بھی بجتے ہیں"
ماتم تو ہو چکے اب نقارے ہی بجنا چاہیئے۔ اتنے میں طاہرہ نے
عجب طرح سے تڑپ کر کہا کہ "ارے اتنی خوشی مت کرو کہ خدا کو بری
لگے۔ یہ سنکر نواب ذرا چین بہ جبیں ہو گیا کہ "آپا آپ لوگوں کی گیا

وا اب تو یہ خیال اور بھی زیادہ دل میں آگ لگا دیتا ہے۔ ہائے کیا نظر بد بھی صاحب ہی کیلئے رکھی ہوئی تھی آجکل تو ترقی کا زمانہ ہے۔ ادنیٰ شاگرد پیشوں کی اولاد صدارت کی کرسی حاصل کر رہی ہے۔ ہماری حیثیت تو کسی زمانہ میں بھی اتنی پست نہ تھی آخر ماموں جان کو ساڑھے تین سو کا گریڈ مل ہی چکا تھا اور ابا جان کی بھی قسمت نے یاوری نہ کی ورنہ وہ بھی علیگڑھ کالج کے ایک پروفیسر ہوتے اگر صاحب عہدہ منصفی کا مستحق قرار دیا یا تو نادر بات کیا تھی۔ جو کرے سیوہ وہ کھائے میوہ۔ آہ! یہ ہماری ہی قسمت کا لکھا ہے کہ سیوا کریں اور میوہ نہ پائیں۔

باتیں ہیں۔ خوشی کے موقع پر بھی خوشی کرنے نہیں دیتے" طاہرہ نے کہا "ہاں زیادہ خوشی مت کرو میرے دل میں وہم آتا ہے۔

ایک دن میں دیوان حافظ دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے بلا کسی خیال کے یکایک میری نظر لفظ "ابوالنصر" پر پڑی اور اسکے ساتھ ہی ایک برقی سرعت سے میں نے پورا شعر پڑھا۔

زشاہ راہ سعادت بہ باغ رضواں رفت

وزیر کامل ابوالنصر خواجہ فتح اللہ

آہ! یہ شعر نہ تھا ایک تلوار تھی جس نے میرے دل کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔ کتنی دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی۔ ایسا معلوم ہوا کہ دل کی حرکت بند ہو گئی ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا دل کو تسلی دی کہ نہ میرا منشا فال دیکھنے کا تھا نہ صفحہ کے شروع کا شعر ہے۔ دیوان حافظ میں ایسے پچاسوں شعر پڑے ہیں۔ خواہ مخواہ ایک نام کو دیکھکر اثر لینا حماقت ہے۔

جانے جانیکے دن، شام شام کے وقت گھر آیا تو چہرہ اترا ہوا دیکھ رابعہ نے مزاج پوچھا۔ بولا "اچھا ہوں آپا! آج میں صبح سے پھر رہا ہوں ہائی کورٹ گیا۔ سلطان شاہی گیا۔ خاتون کے ہاں گیا۔ کہاں کہاں گیا تھک گیا ہوں" رابعہ نے کہا "اللہ تم کو ہمیشہ اچھا ہی رکھے۔ خدا کرے کہ تیری بلا لے کر میں چلی جاؤں۔ تو اچھا رہے۔" بولا "ہم ہی سب کی بلا لے کر جائینگے۔ سب بھائی بہنوں میں میرا نمبر پہلا ہے" عین سفر کے وقت اسکے اس کہنے سے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور رابعہ نے خفا ہو کر

وفات ۔ دالدہ طاہرہ (؟)۔

مت کرا ایسی باتیں۔ کچھ دل دکھانے میں تجھے مزا آتا ہے" شرارت سے ہنسنے لگا کہ" پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں ہمارا دل نہیں دکھتا"
اگرچہ ایسے ایسے خدشے کبھی کبھی دل میں اکر تھوڑی دیر کیلئے پریشان کر دیتے تھے۔ لیکن محض ایک ہوا کا جھونکا کہ ادھر آیا ادھر گیا۔ یہ تو حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ لایعنی تو ہمات حقیقت بن جائینگے اور اسقدر جلد ہماری مسرت کا جام چکنا چور ہو جائیگا۔

ابر لق مے مرا شگستی ربی — بر من در عیش را بہ بستی ربی
بر خاک فگندی مے گلگون مرا — خاکم بدہن......

جالنہ کی روانگی

زقدرت ملکوتش یکے نشاں آں است
کہ کارہا بہ خلاف مراد ما افتد

سب بھائی بہن نہایت مسرت و شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ نواب کی شادی کے مشورے تھے۔ تحصیلدار صاحب[1] کو خط لکھا گیا تھا کہ ۲۷ رجب تاریخ عقد مقرر کیجائے۔ انتظار تھا کہ جواب آنے پر تیاری شروع ہو۔ مگر ع
ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال ۔ دو چار روز پیشتر صاحب کو نزلہ کے ساتھ بخار ہو گیا تھا جسکی وجہ سے وہ دفتر نہیں جا سکا تھا۔ اس دن دفتر جانیکا ارادہ تھا کہ صبح کے وقت سہ شنبہ کے دن چپراسی مراسلہ لیکر پہنچا۔ لفافہ کو دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو گیا اور وہ بھی پڑھنے کے بعد

[1] دلہن کے والد

افسردہ ہو کر بولا کیا کوفت ہے بھئی! ہم سمجھے تھے بھائی جان کی شادی وغیرہ سے فراغت کر کے اطمینان کے ساتھ جائینگے۔
اگرچہ اس بات کا تو یقین تھا کہ صاحب عنقریب کسی ضلع پر بھیجے جانے والے ہیں اور میں نے پہلے سے ہی فیصلہ کر رکھا تھا کہ بغرض تبدیل آب و ہوا اس کے ساتھ جاؤنگی تاہم اسقدر جلد جانیکی امید نہ تھی۔
خیر اس نے ہائیکورٹ جا کر ایک ہفتہ تہیہ سفر کے بجائے پہلی دے تک مہلت لی اور تیاری سفر میں مصروف ہوا۔ مگر صاحب کو خدا جانے کیوں (آہ! اس وقت وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی) جانے کا افسوس تھا۔ ایک دن کہا۔ ویسرائے آنیوالے ہیں اور ہم حیدر آباد سے جا رہے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی تماشہ ہیں ہوتا تو کتنی کوفت تھی۔ مگر ہمکو کیا! ہم یہاں رہتے تو کیا حصہ لیتے۔
سال کا آخر ہونے کی وجہ سے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کیونکہ عنقریب ہمارے اسکول میں امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ لیکن طاہرہ ساتھ چلنے کیلئے بہت بضد ہوئیں۔ مگر اس نے سمجھایا کہ آپا! اس وقت آپکا چلنا نامناسب ہے۔ ابھی تو میرے قیام کا کوئی ٹھیک نہیں۔ مرد ملازم میرے ہمراہ رہیگا۔ آپ کو پردہ کی تکلیف ہوگی۔ پھر بھائی جان کی شادی ہونے والی ہے مجھے خود آجانا پڑیگا۔ شادی کے بعد دیکھینگے۔
جانے سے پیشتر تمام دوست احباب عزیز و اقارب سے جا کر ملا۔ اکثروں نے امام ضامن باندھے۔
۵ / نومبر ۱۹۲۹ء یکم دے روز سہ شنبہ کو رات کے نو بجے سب سے مل ملا کر ہزاروں دعائیں لیکر گھر سے رخصت ہوئے۔ چھوٹا بھائی بہنوئی اور کوئی دوست اسٹیشن پر پہنچانے گئے اور ہنسی خوشی ریل پر سوار کیا۔

چوتھے دن (شنبہ) خط آیا (میرے نام) وہاں کی تفصیلی کیفیت لکھی تھی مگر سر عنوان یہ شعر تھے۔ سب کو بڑا برا لگا کہ خوشی کے موقع پر ایسے غمگین شعر کیوں لکھے۔ ہائے تقدیر نے اسکی قلم سے نکلوا دئے تھے۔

ما برفتیم و تو دانی و دل غم خور ما — بخت بد تا بہ کجا می برد آبشخور ما

فلک آوارہ بہ ہر سو کندم می دانی — رشک می آیدش از صحبت جان پرور ما

سفر آخرت

اے فلک دہ کہ دلم خستہ و ویران کردی — خاطر جمع مرا باز پریشاں کردی

گوہرے کان بکفم بود ز اغیار نہاں — آشکارا ز نظرم بروی و پنہاں کردی

یوسفم را بہ کف گرگ نہادی و مرا — در غمش معتکف کلبۂ احزاں کردی

در گل تیرہ نہادی گل نو رستہ من — روز من با شب تیرہ زچہ یکساں کردی

حاصل آنکس کہ از و بود سر و سامانم — بروی او را و مرا بے سر و ساماں کردی

سرو من بروی ازین باغ بہ زندان لحد — باغ را بر من ماتم زدہ زندان کردی

آن برادر کہ دریں شہر غریب آمدہ بود — جاش در دشت بہ پہلوے غریباں کردی

جمعہ (۱۱ رد ے) کو تمام دن میرا دل صاحب میں لگا رہا۔ ذرا دروازہ پر کھٹکا ہوتے ہی خیال ہوتا کہ شاید خط آیا۔ آخر مغرب کے وقت خط آنے سے نا امیدی ہوگئی تو میں نے طاہرہ سے کہا کہ آج مجھے صاحب بہت یاد آرہا ہے۔ یقینی یہ گھر میں رہنے کی وجہ ہے مدرسے کے دن تو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

ہفتہ کے دن ساڑھے دس بجے جالنہ سے گھر پر تار آیا میں

ف ۔ یہ مصرعہ مکرر لکھا تھا۔

اور رابعہ اسکول میں تھے۔ وہیں اطلاع ملی سنتے ہی پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ تمام جسم میں لرزہ پڑ گیا۔ ہر چند دل کو تھامتی ہوں مگر رہ رہ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ یا اللہ وہ مستقل مزاج بچہ ہے ذرا سی بیماری سے گھبرانیوالا نہیں۔ ایسی کیسی طبیعت خراب ہوگئی کہ واپس آرہا ہے اور ایکدم تار دیدیا۔ بہ مشکل تین گھنٹے گزار کر پریشان حال گھر آئے تو گھر والوں کو اپنے سے زیادہ پریشان پایا۔ اماں ایک طرف مضطرب ہیں۔ طاہرہ ایک طرف رو رہی ہیں۔ حبیبہ الگ حواس باختہ کھڑی ہے۔ آخر سب کی یہی صلاح ہوئی کہ پہلے ڈاکٹر کرلوسکر کو دکھانا چاہیے۔ پھر جو اس کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے۔

سردار حبیب دولھا اور دو تین دوست سکندرآباد اسٹیشن گئے سردار جاتے جاتے کرلوسکر کے دواخانہ میں کہتا گیا کہ میں بھائی کے آنے پر ڈاکٹر صاحب کو لیجاؤنگا۔ یہ سب تو ادھر گئے یہاں ہماری عجیب حالت! بس ساکت و صامت بیٹھے ہیں اور اس امید پر دل کو تسلی دے رہے ہیں کہ اب صاحب کو دیکھکر تسکین ہوگی۔ آخر خدا خدا کر کے رات کے دس بجے موٹر آئی۔ اترتے ہی صورت جو دیکھی تو سب کی جان نکل گئی کہ ہائے چار دن میں اسکا یہ حال ہوگیا! ہاتھ پیر ٹھنڈے برف پسینہ جاری ہچکی دم نہیں لیتی۔ دم پھول رہا ہے۔ سردار اسیوقت الٹے پاؤں کرلوسکر کے پاس بھاگا مگر وہ ملا نہیں تو آتے آتے حکیم صاحب کو لیتا آیا۔ حکیم صاحب بھی نبض دیکھکر پریشان ہوگئے۔ کہا کہ اسقدر نقیہ ہے جیسے کالرا کے مریض کی ہوتی ہے خیر کچھ دوا دی۔ صاحب نے خود حکیم صاحب اور ہم سب سے اپنی کیفیت

دم لے لے کر یہ بیان کی کہ "پیر کے دن دفتر سے آنیکے بعد یکایک قے ہوگئی (اس سے پہلے متلی بھی تھی) مین نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ دوسرے دن (سہ شنبہ) طبیعت بالکل صاف تھی۔ کچھ گرانی وغیرہ نہیں معلوم ہوئی۔ رات کے کھانے میں چاول ذرا سخت تھے منصف صاحب نے منع بھی کیا مگر مین نے یہ کہکر کہ کچھ مضائقہ نہیں دو چار نوالے کھا لئے۔ صبح کے پانچ بجے (چہار شنبہ) سے پیٹ میں درد شروع ہوا۔ پہلے تو روڈ مکسچر پیا۔ جب درد بڑھنے ہی لگا تو جالنہ کے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ جمعرات کو ذرا درد میں افاقہ معلوم ہوا مگر پھر جمعہ کو شدت ہوگئی اور بخار بھی آگیا (۱۰۳) تو ڈاکٹر نے اپنڈی سائٹس کا شبہ بتلا کر حیدرآباد جانے کی رائے دی۔ اور منصف صاحب۔ تعلقدار صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے آج صبح سات بجے لاکر ریل پر سوار کرا دیا۔ غذا کے متعلق کہا کہ اس اثنا میں بہ مشکل پاؤ سیر دودھ پیا ہوگا۔ ڈاکٹر نے پانی کو بھی منع کر دیا ہے۔ صرف سوڈا پینے کے لئے کہا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ ہچکیاں سوڈے کی وجہ سے آرہی ہیں۔"

تمام رات پلک سے پلک نہ لگنے پائی کسی پہلو قرار نہ تھا۔ کبھی پاؤں پھیلا دیتا۔ کبھی سمیٹ لیتا۔ کبھی یہ کروٹ بدلتا کبھی وہ ہچکی کے ساتھ چہرہ متغیر آنکھوں پر اضطراری کیفیت طاری ہوجاتی اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے چمکنے لگتے۔ ہاتھ پاؤں اسی طرح سرد۔ سانس کا وہی عالم۔ کرب غضب کا۔ پوچھتے صاحب! تم اتنے بےکل کیوں ہو؟ تو کہتا آیا پیٹ میں بےچینی ہے!"

صبح ہوتے ہی (یکشنبہ) حکیم صاحب خود آئے۔ بہت دیر تک بیٹھے دیکھتے رہے۔ آخر یہ کہا کہ میں کسی ڈاکٹر کو اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہوں

یہاں پہلے ہی سے سردار ڈاکٹر کرتو سنگھ کو لانے گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب آگئے۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے اینما دیا۔ بار بار کیفیت پوچھتے اور تعجب سے کہتے آپ صرف چار دن سے بیمار ہیں" ڈاکٹر (جالندھا کی رائے ظاہر کی تو کہا میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پیٹ میں سختی کس وجہ سے ہے۔ چلتے ہوئے کہا کہ تین بجے تک میری دوا پر رکھو اور مجھے اطلاع دو اور اگر قے ہو فوراً کسی ہسپتال کو لیجاؤ۔ میرے پاس آکر اطلاع کرنیکی بھی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر کی دوا سے ذرا افاقہ معلوم ہوا چہرہ پر بحالی آئی اور ہاتھ پاؤں میں کچھ گرمی بھی۔ لیکن حرارت بڑھنے لگی اور ایک بجے بخار ۱۰۱ ہو گیا (ڈاکٹر کے سامنے ٹمپریچر ۱۰۰ تھا) فوراً اطلاع دی گئی۔ کیفیت سنکر ڈاکٹر نے ہسپتال لیجانے کو کہا۔ سب گھر والوں کی رائے سول ہسپتال کی تھی مگر صاحب کے کئی دوستوں کی جو میڈیکل سے تعلق رکھتے تھے صلاح ہوئی کہ جنرل ہسپتال لے چلنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک تو سکندر آباد گھر سے دور ہے۔ دوسرے یہاں ہم سب ہیں ہر طرح کی امداد اور ہر قسم کی آسائش پہنچا سکینگے۔ دونوں بھائیوں نے صاحب سے پوچھا۔ کہا " اچھی بات ہے جنرل ہسپتال ہی چلو"

اس کے بعد صابون پانی منگوا کر لیٹے لیٹے منہ دھویا۔ کپڑے بدلے۔ اتنے میں موٹر آگئی تو پلنگ سے سرک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہائے اسوقت کا سماں میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ نہیں سکتا! اس کا وہ استقلال کے ساتھ کرسی پر بیٹھنا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر سب کو سلام کرنا (علالت کی کیفیت سنکر بہت لوگ مزاج پرسی کے لئے آئے تھے) وہ اک اک کے چہرہ پر عجیب انداز سے مسکرا کر نظر ڈالنا۔ رابعہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھکر کہا " ہیں! آپا بیگم آپ روتی ہیں۔ میں تو اچھا ہونے کو

جا رہا ہوں" جب کرسی اٹھائی گئی تو خالہ جان نے کہا "خدا حافظ! ان کی طرف منہ پھیر کر بولا "قبول کیا"۔

غرض کرسی اٹھا کر باہر لیگئے۔ دونوں بھائی۔ بہنوئی اور چھ سات دوست ساتھ گئے اور آہ! ہم کو نیم جان تڑپتا پھڑکتا چھوڑ گئے۔ بس ہماری قسمت کا یہ آخری دیدار تھا اور انہیں ہمارے ہاتھوں میں پندرہ گھنٹے رہنا تھا۔!

رات کے آٹھ بجے نواب نے ہسپتال سے آکر کہا کہ بعض چھوٹے بڑے ڈاکٹروں کا خیال اپنڈی سائٹیس ہی کا تھا اور فوری آپریشن ضروری سمجھتے تھے۔

ف۔ آہ! اپنڈی سائٹس! کاش امانجان کے خدشہ کے مطابق دق ہی ہو جاتی تو یہ کہکر دل کو سمجھاتے کہ اس کا مادہ اس میں موجود تھا۔ اگر انفلوائنزا یا نمونیہ ہوتا تو شاید اس خیال سے تشفی ہوتی کہ جاڑے کے موسم میں رات کے وقت سفر کیا تھا۔ نزلہ بگڑ گیا۔ آہ! یہ کیا مرض! جسکا کسی کو شان و گمان بھی نہ تھا۔ اور اگر بالفرض اپنڈی سائٹس ہی ہو (اصل تو قطعی تشخیص ہوئی نہیں ڈاکٹر صرف شبہ ہی شبہ کہتے رہے) تو کیا یہ کمبخت موذی بیماری ایک ہفتہ پیشتر جالندھر جانے سے قبل یہاں نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ خیال تو دل کے پرخچے نہ کرتا کہ ہائے بحالت مرض میں ریل کا سفر اس کیلئے مضر ہوا۔ یا اس کی بیماری آدھی ادھر آدھی ادھر ہو گئی کہ علاج معالجہ کی مہلت نہ ملی۔ ایک لحاظ سے صاحب کی صحت عامہ بہت اچھی تھی کہ حیدرآباد کے انیس سالہ قیام میں وہ سوائے ملیریا بخار کے (دو تین سال) کسی اور مرض میں کبھی مبتلا نہ ہوا۔ حالانکہ یہ مقام متعدی امراض کا گھر ہے یہاں برس کے بارہ مہینے پلیگ۔ انفلوائنزا۔ کالا چیچک۔ نمونیہ۔ ٹائیفائیڈ ایک نہ ایک آفت نازل ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یوں تو وہ ہر وبائی مہلک مرض سے بالکلیہ محفوظ رہا۔ اور آہ! مرض الموت آیا تو ایسے موقع پر آیا کہ سنبھلنے سدھرنے بلکہ تشخیص مرض تک کرنے کی فرصت نہ دی۔ کیا اپنڈی سائٹس کے مریض صحت یاب نہیں ہوتے! ہائے بوٹی کی بوٹی نہیں۔ جب وقت آجاتا ہے تو ایسے ہی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

مگر ڈاکٹر خورشید حسین صاحب کی رائے یہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ چوبیس گھنٹے کے بعد مرض کے متعلق وہ اپنی رائے کا اظہار کرینگے۔ لیکن دودھ میوہ کا عرق پانی دوا وغیرہ کیلیئے بالکل منع کر دیا ہے۔ جب پیاس معلوم ہو صرف برف دی جائے۔ ہائے جانی! تونے یہ کسر بھی نہ چھوڑی۔ بھوکا پیاسا دنیا سے رخصت ہوا۔ بس تیرے حصہ کا وہی چھٹانک بھر دودھ تھا جو ڈاکٹر کرلوسکر کے کہنے سے طاہرہ نے پلا دیا تھا!

(دوشنبہ) صبح ہی سردار نے (جو رات کو بھائی کے پاس رہے تھے) آکر یہ کیفیت بیان کی کہ اگرچہ رات کو بے چینی بھی رہی مگر تھوڑی تھوڑی دیر کو آنکھ بھی لگ جاتی تھی۔ یہاں کی بہ نسبت وہاں ہر ایک شکایت میں کمی ہے۔

اب جو آتا ہے یہی خبر لاتا ہے کہ حالت بہتر ہے۔ میں نے نواب سے کہا "مجھے تم لوگوں کی باتوں کا یقین نہیں آتا جب تک میں صاحب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لونگی دل کو تسلی نہیں ہو گی۔ مجھے لے چلو" نواب نے کہا: "آپا تیسری منزل پر وہ وارڈ ہے۔ آپ اتنی سیڑھیاں کیسے چڑھ سکینگی۔ ذرا صبر کیجیئے۔ میں آپ کے لئے لفٹ کا بندوبست کر کے کہلا بھیجتا ہوں"

نواب کے جانے کے تھوڑی دیر بعد احمد حسین (صاحب کے مخلص دوست) نے آکر کہا۔ "لفٹ کی اجازت ملگئی ہے۔ شام کو عون اللہ آکر آپ سبکو لیجائینگے۔ تیار رہئے"۔

انتظار کرتے کرتے جب آٹھ بج گئے اور کوئی نہیں آیا تو پریشانی ہونے لگی اور جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے ہول بڑھ رہا ہے۔ امی تو اضطرابی حالت میں پھاٹک کے باہر نکل گئیں۔ آخر گیارہ بجے رات کو

سردار آیا اور کہا کہ " وارڈ سے پھر سے ذرا گرم ہو گیا تھا اور وزیٹرس بہت آسئے تھے۔ مغرب سے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بے چینی اور گھبراہٹ تھی۔ ڈاکٹر صاحب (خورشید حسین) نے آکر انجکشن دیا اور نہایت سختی کے ساتھ وزیٹرس کو روک دیا ہے صرف دو آمیوں کو اندر رہنے کی اجازت ہے۔ آج ف بھائی جان اور عبداللہ صاحب

ف اسکی زندگی کی آخری شب نواب اسکے پاس رہے تھے۔ رات کو اس نے عالم بے حواسی اور حالت بحران میں جو باتیں کیں نواب پر اسکا بہت اثر رہا۔ بعد انتقال اس نے وہ بیان ایک پرچہ پر لکھکر رکھا تھا اور اب تک اسے پڑھکر خون کے آنسو بہاتا ہے۔

سب کانشنس Sub-conscionsness انسان کی وہ حالت ہے جسمیں اسکی فطرت اور اخلاقیت کا حقیقی مظاہرہ ہوتا ہے۔ آ ہ صاحب کا آخری وقت کا ہذیان بتارہا ہے وہ اخلاق و راست بازی کا مجسمہ کن جذبات عالیہ کا حامل تھا۔

" بھائی جان آپ کو معلوم ہے جاگیر کا مقدمہ ...... میں ہائی کورٹ جاتا ہوں .... ہزاروں آدمی کشت و خون کر رہے ہیں۔ اسی زمین کا مقدمہ ہے جہاں ٹینس کھیلتے ہیں۔ یہہ بیماری مجھے ہوئی "

اور بستر سے اٹھنے لگے میں مدد کیلئے کسی کو بلانے والا تھا کہ ڈاکٹر خورشید حسین صاحب آگئے ان سے حسب ذیل باتیں کیں۔

"I want to go to High Court, Doctor."

Doctor—"Why?"

"Thousands of people are quarrelling, and I alone can settle the dispute.....................Look at my reasons, Doctor. I am going to High Court. If I have nerve enough I will come back and you can cure me. If not let me die. A life of dishonesty is a life of disgrace.......................You found a good

بھائی کے پاس رہینگے۔

دوسرے دن (سہ شنبہ) اگرچہ تھکن اور پریشانی کی وجہ سے کچھ دم باقی نہ تھا مگر یہی مناسب معلوم ہوا کہ مدرسے چلے جائیں

opportunity yesterday, I could not get up from my cot. But I have nerve now to dress myself and can call a car."

پھر کھڑا اٹھنے کی زبردست کوشش کی لیکن میں نے تھام لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا: "آج رات کو دو اٹنڈنٹس آپ کو رکھنا چاہئیے اور سنبھالنا چاہئیے۔" کہنے لگے: "آپ ایک اٹنڈنٹ بھی مت رکھئیے میں نہیں اٹھونگا" اور لیٹ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد:۔

"بھائی۔ یہ سب آپکی۔۔۔ آپا۔۔۔ آپا بیگم کی محبت کی وجہ ہے ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔"

(خدا جانے اسکا کیا مطلب تھا)۔

تھوڑی دیر بعد:۔

"بھائی جان۔ موت وحیات کی کشمکش شروع ہوگئی۔۔۔۔۔ اب ہم بچھڑتے ہیں خدا حافظ" بھائی جان افسانہ تھا افسانہ۔ سردار نے پوچھا "بھائی کیسی طبیعت ہے۔" کہا۔ "سب تمہیں لوگوں کا طفیل ہے۔" "سردار آپ نے مجھے پہچانا"۔ چیں بجبیں ہوکر جواب دیا۔ "بعض لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں بعض کہتے ہیں بخارات دماغ پر چڑھ گئے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔" سردار حقیقت کیا ہے؟ "سب لوگوں نے اپنا مطلب نکال لیا۔۔۔۔۔۔

But I am pure, simple and honest رات کے آٹھ بجے نرس آئی اور بیلاڈونا لگانے کے لئے فومنٹ کرنا شروع کیا (انکی مرضی کے خلاف) تو بگڑ کر نرس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ میں نے چھڑانا چاہا تو کہا۔ "آپ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ اچھا۔" اور ہاتھ چھوڑ دئے۔ نرس بیلاڈونا لگا کر چلی گئی۔ "اس نے بیلاڈونا میں زہر بھر دیا بھائی جان۔ یہی ہے یہی ہے۔" اور بڑے کرب کے ساتھ تھوکنا شروع کیا "یہ دیکھو زہر"

اور ہم دونوں اسکول چلے گئے۔ وہاں جو پوچھتا ہے کہ آپ کے بھائی کا مزاج
کیسا ہے! تو بجائے جواب کے انکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں۔ جوں
توں وقت گذار کر اب آ ہی رہے تھے کہ اطلاع ملی گھر سے کوئی بلانے کو
آیا ہے۔ بس سنتے ہی یقین ہو گیا کہ صبو پیارے نے دغا دیدی۔ آشفتہ حال
گھر پہنچے۔ ہائے اترتے ہی کیا دیکھا! زمانہ کا انقلاب۔ آسمان کی نیرنگی
قسمت کی بیوفائی۔ انسان کی مجبوری۔ خدا کی بے نیازی کی شان نظر آئی!!

ہائے اجل آگئی موت اسے بھاگئی ؎ کس کی نظر کھا گئی شیر جوان مر گیا
شیر پڑا سوتا ہے دیدہ و دل روتا ہے ؎ ٹکڑے جگر ہوتا ہے شیر جوان مر گیا
گودی کا پالا مرا گیسووں والا مرا ؎ گھر کا اجالا مرا شیر جوان مر گیا
ہائے مرا نازنیں ہائے مرا مہ جبیں ؎ بھیگیں ابھی تھیں نہیں شیر جوان مر گیا

اسکے بعد چند ڈاکٹر اور مدد آئی۔ "Bequiet be patient" How to be quite
اور تینوں ڈاکٹروں کو مخاطب کرکے۔ when the deart is cut with poison
آپ ڈاکٹر صاحب۔ آپ ڈاکٹر صاحب۔ آپ ڈاکٹر صاحب۔ میرا بدلہ لینا..... مدد تم میرا انتقام لینا
اگر آپ بھائی ہیں اور "احمد"۔ اگر تم دوست ہو تو میرا انتقام لینا۔"

الکائی کا سلسلہ تھا

"میرا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے ... Justice .. ایک بیگناہ کا قتل ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر خورشید حسین آئے
اور مارفیا کا انجکشن دیا اسکے باوجود رات بھر وہ کرب اور ایسی تڑپ رہی کہ الامان والحفیظ صبح کے
قریب سکون ہوا۔ دوپہر تک بالکل خاموش رہے۔ عبداللہ صاحب قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ تو جہ سے
سنتے رہے۔ معلوم بھی نہ ہوا کہ کس وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

دل پتھر ہو گیا۔!

ان نینوں کا یہی بسیکھ　　　　وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

ہائے ہائے اس کے بعد یا اللہ! کیا لکھوں!!

۱۹ر نومبر ۱۹۲۹ء ۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ ۵ار دے ۱۳۳۹ف روز سہ شنبہ رات کے نو بجے (عین وہی وقت جب جالنہ سدھارے تھے) وہ سرمایۂ امید وہ راحت جاں۔ وہ سرور دل۔ وہ پر حسرت و حرماں نصیب دولھا اپنی برات احباب و اعزہ کے مجمع کثیر کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر سے روانہ ہو گیا۔

سرو سیمینا! بہ صحرا می روی　　　　نیک بد عہدی کہ بے ما می روی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو　　　　تو کجا بہر تماشا می روی

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست　　　　تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

ہم ہیں سے اپنے ساتھ کسی کو نہ لے گئے

جس دم طلب ہوئی تو اکیلے چلے گئے

آ موت! اے ظالم! اے تفرقہ پرداز! اے امیدوں کو ملیا میٹ کرنے والی! اے تمناؤں کو خاک میں ملانے والی! ہائے تجھے ترس نہ آیا کہ کس چراغ کو تو نے گل کر دیا۔ کیسے چاند کو زیر زمیں چھپا دیا۔ ہائے کتنی جانیں اس سے وابستہ تھیں۔ ایک پورے خاندان کی آنکھ اس پر لگی ہوئی تھی۔ اے ناخدا ترس! اگر تجھکو ہم پر رحم نہیں آیا تھا تو کاش اس کی جوانی پر رحم کرتی۔ اسکی قابلیت اسکی لیاقت پر رحم کرتی۔ ارے ظالم! اس نے سولہ برس محنت کی تھی اتنی مہلت دیتی کہ وہ کچھ تو اپنی قابلیت کا جوہر دکھا دیتا۔ کچھ تو اپنی جانکاہی کا صلہ لیتا۔ مگر نہیں نہیں! بیچاری تو تو خود مجبور ہے۔ تو اک تازیانۂ عبرت ہے۔ تو حکم الٰہی ہے۔ تو ہی ہے جو مغرور اور سرکش سروں کو ایک قادر مطلق کے آگے جھکا دیتی ہے۔

آہ! یہیں اسی مرکز پر آکر انسان ضعیف البنیان انسان کو تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے!
اے مالک الملک! اے حی وقیوم اے واحد القہار! جہاں ترے نام
کریم رحیم غفار وہاب ہیں وہیں میرے مالک! تیرا ایک نام جبار بھی تو ہے میرے مولا!
تو کبھی کبھی اپنے عاجز بندوں کو اپنی شان جباری شان کبریائی شان استغنا بھی
تو دکھاتا ہے۔

اے رحمت اور ہیبت والے	شفقت اور دباغت والے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے	تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
تو ہی پلائے زہر کے پیالے	تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا	تو ہے سہارا غمگینوں کا

یا اللہ۔ اب تو ہی دلوں کا تھامنے والا ہے۔ آہ! دامن صبر چاک چاک
ہوا جاتا ہے! پائے ثبات کو لغزش ہے! خداوندا! توفیق صبر عطا فرما!
اور خاتمہ بالایمان کر! تیرے حبیب پاک کا ارشاد ہے

الدنیا سجن المومنین وجنتہ الکافرین

خدایا۔ ہم غریب عاجز مجبور رنجور خستہ دل گنہ گار بندوں کا حشر گروہ
مومنین کے ساتھ فرما!۔

خدایا جہاں بادشاہی تراست	ز ما خدمت آید خدائی تراست
پناہ بلندی و پستی توئی	ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک
ذوالجلال والاکرام

☆ ☆ ☆

از صفوۃ الرحمٰن صابر

سرگذشتِ منظوم

سرگذشت اک عزیز کی سن لو
دونوں ہاتھوں سے تھام لو دل کو

وہ لڑکپن سے سب کا پیارا تھا
کیا سعید اور نیک لڑکا تھا

فرمانبردار تھا بزرگوں کا
سامنے ان کے سر جھکاتا تھا

نیکیوں کا وہ دل سے جویا تھا
وہ بری صحبتوں سے بچتا تھا

تھا زمانہ ابھی لڑکپن کا
باپ کا سر سے اٹھ گیا سایا

مادرِ مہربان، کہ رحمت تھیں
چھوڑ کر وہ بھی سوئے خلد گئیں

لیک تعلیم اس کی جاری تھی
بھائی بہنوں نے سرپرستی کی

پڑھنے لکھنے کا شوق رہتا تھا
ایک پتلا تھا وہ ذکاوت کا

کھیل بھی اس کے تھے تو معمولی
کبھی اس میں بھی لی نہ دلچسپی

رہا اول، جو امتحان دیا
مڈل، میٹرک اور ایف اے کا

میٹرک میں رہا تھا جو اول
تو ملا اس کو شاکر اس مڈل

مدرسہ سے ملا اسے انعام
آبِ زر سے لکھا ہی اس کا نام

پھر دیا امتحان بی۔ اے کا
اور دوم میں کامیاب ہوا

قابلِ غور ہے یہ بات ذرا
کوئی اس سال فرسٹ ہی نہ ہوا

پھر بھی انگلش میں سب سے اول تھا
اس بلندی سے وہ کبھی نہ گرا

دام میں طائرِ ترقی تھا
یونیورسٹی میں بھی شہرہ ہوا

---

[1] ہمشیرزادہ مولوی سید حسن صاحب منصف۔

رہا اول وہاں بھی پر جوہر — جیت کر لایا تمغۂ وا کر
ہر جگہ اس کا ذکر ہوتا تھا — ہر زباں پر اسی کا چرچا تھا
پھول پہنائے سب نے جی بھر کے — کئے جلسوں پہ جا بجا جلسے
جب احبا کی یہ مسرت تھی — تو عزیزوں کو کیا خوشی ہوگی
جس کو دیکھو اسی کا دیوانہ — شمع عارض کا اس کی پروانہ
اس کے اخلاق کا بیاں ہو کیا — شکل انساں میں وہ فرشتہ تھا
وہ فرشتہ نہیں تھا انساں تھا — مظہر شان رب رحماں تھا
صاف باطن تھا خوش طبیعت تھا — نیک کردار نیک طینت تھا
گرچہ بے حد تھی اس میں خودداری — کبر و نخوت سے تھا مگر عاری
کبھی اس کو غرور ہی نہ ہوا — گرچہ وہ اک غیور دل کا تھا
واقعی اس میں کیا فراست تھی — طبع میں اس کی کیسی جودت تھی
ہر نشیب و فراز سے آگاہ — عقل و دانش میں فرد تھا واللہ
بھائی بہنوں کا دل سے شیدا تھا — ان کی ہر ہر ادا پہ مرتا تھا
ان میں بیمار جب کوئی ہوتا — چین اس کو کبھی نہ آتا تھا
رات بھر نیند ہی نہیں آتی — اس کو اس درجہ رہتی بیتابی
جنکر ان کو تو آپ بھی غمگیں — رنج ان کو اگر تو خود بھی حزیں
ان کے آرام کا خیال اسے — ان کے ہر کام کا خیال اسے
وہ تکالیف خود اٹھاتا تھا — اور آرام سب کو پہنچاتا
دوست احباب جس سے ملتا تھا — انکساری سے جھک کے ملتا تھا
اس کی باتوں میں سحر تھا گویا — بات کرتا تو دل لبھا لیتا
دوست تھا صاحب مروت تھا — اس کا دل کشتۂ محبت تھا

وہ کسی کو نہیں ستاتا تھا — دل کسی کا نہیں دکھاتا تھا
تھا خلیق اور باحیا صاحب — کیا صالح جوان تھا صاحب
جب کبھی اس سے ملنے جاتے ہم — ہو کے مسرور گھر کو آتے ہم
تھا وہ بچپن سے ہی ذکی الحس — ترچھی نظروں کو جانتا تھا بس
ٹوکتا کوئی تو بگڑتا تھا — کچھ عجب دل دماغ پایا تھا
تھا فنون ادب کا ذوق اسے — شعر گوئی کا بھی تھا شوق اسے
کیا تخیل بلند تھا اس کا — اور جذبات کس قدر اعلےٰ
تھی فصاحت زبان میں کیسی — مجھ سے سن لیجے اک غزل اس کی

غزل

ایک لذت ہے سیر دریا میں — اک تماشا ہے کوہ و صحرا میں
سو مجالس ہیں کنج عزلت میں — لاکھ نغمے ہیں قعر دریا میں
سن نوائے سرود فطرت — ریزش آبشار و دریا میں
دیکھ نیرنگ صنعت انساں — صفحۂ پردۂ سینما میں
ذرہ ذرہ ہے یاں سبق آموز — "کہہ تو بیکار کیا ہے دنیا میں"
شیخ آخر کو بات چھپ نہ سکی — کتنے مضموں تھے لغزش پا میں
ہم تو ڈھونڈیں گے وہ ملے نہ ملے — لطف مضمر ہے سعی بیجا میں
اتنا ٹوٹا کہ فرق کچھ نہ رہا — ان کے وعدہ میں میری توبہ میں
زاہد خشک اور رقص و سرود — کتنی کیفیتیں ہیں صہبا میں

خوب لکھتا تھا نامۂ منظوم — قیصر و کامل تھا صاحب مرحوم
کسی نامہ کا ہے جواب سنو — ظلم ہوگا گر اس کی داد نہ دو

نامہ

دو بجے دن کو اتفاق سے آج — فوجداری یہ کمشنری پہنچا
دوسرا خط جناب عالی کا — پیش اجلاس اولیں پہنچا

پہلے خط کا بھی دیکھ چکا ہوں جواب — کیا جواب آپ کو نہیں پہنچا

پیتہ کا چیکوڑہ میں قاصدا! یہ خط — بہ درِ دولت مستیں پہنچا

ہائے کیا گوہرِ درخشاں تھا — ہائے کن خوبیوں کا انساں تھا

کیا ہی خوش رنگ وہ گلِ تر تھا — اس کی خوشبو سے گھر معطر تھا

صرف چوبیس سال کا سن تھا — منصبِ منصفی خدا نے دیا

دن تھا منگل کا اور پہلی دے — وہ گیا سوئے جالندھر ہے ہے

آٹھ دن بھی رہا نہ خدمت پر — لگ گئی حاسدوں کی اس کو نظر

آٹھویں دے کی یوم سہ شنبہ — دفعتاً درد پیٹ میں اٹھا

چار دن واں رہا علاج اس کا — اور بگڑتا گیا مزاج اس کا

وہ یہاں آیا ہو کے زار و نزار — تین دن اور رہا یہاں بیمار

وہی سہ شنبہ اور تھی پندرہ دے — کیا قیامت ہے مر گیا ہے ہے

آہ کیا جاں گداز صدمہ ہے — دل جگر پاش پاش ہوتا ہے

مرنا قسمت میں سب کی لکھا ہے — اس کا مرنا غضب کا مرنا ہے

لطف اٹھایا نہ زندگانی کا — پھل بھی پایا نہ کچھ جوانی کا

کیسا ارماں بھرا تھا دل اس کا — موت نے خاک میں ملا ڈالا

یوں وہ دنیا سے چل دیا گویا — کچھ سزاوار آرزو ہی نہ تھا

ہائے وہ باکمال اب نہ رہا — ہائے وہ خوش خصال اب نہ رہا

کمال

نہ رہا فخرِ خاندان صبیا — رونقِ بزمِ دوستاں نہ رہا

ہائے اس طرح کر گیا بسمل — عمر بھر مضطرب رہے گا دل

کچھ نہ ہوگا کبھی یہ سوزِ جگر — خوں بہاتا رہے گا دیدۂ تر

بڑھ گئی سوزشِ نہاں صابر — اب نہیں طاقتِ بیاں صابر

قطعۂ تاریخ وفات

دیوانہ سا میں جو ہو رہا ہوں ۔۔۔ کیا پوچھتے ہو۔ کہ کیا ہوا ہے
جو پھول تھا زینت گلستاں ۔۔۔ قدرت نے اسی کو چن لیا ہے
اک تازہ نہال کو خزاں نے ۔۔۔ جڑ پیڑ سے خشک کر دیا ہے
تھی آنکھ ہماری جس سے روشن ۔۔۔ وہ نور ہی اب نہیں رہا ہے
خوش ہوتے تھے جس کو دیکھ کر ہم ۔۔۔ وہ آج ہمیں رُلا رہا ہے
کیوں ہم سے خفا ہو تو صاحب ۔۔۔ ہنستا ہے نہ آج بولتا ہے
بیزار ہوا ہے اس قدر کیوں ۔۔۔ منہ موڑ کے ہم سے جا رہا ہے
سن لے نہیں ذکر غیر صاحب ۔۔۔ تیرا ہی زبان پہ مرثیا ہے
چھلنی ہے کلیجہ تیرے غم سے ۔۔۔ دل سینہ میں ہے کہ جل رہا ہے
جب تو ہی نہیں رہا جہاں میں ۔۔۔ پھر جینے میں کیا مزا رکھا ہے
ہے ہے نہیں اختیار اپنا ۔۔۔ قدرت کا عجب معاملہ ہے
ہم صید ہیں اس کے دام کے اور ۔۔۔ وہ آہ نشانۂ قضا ہے

۳۹ ف ۱۳

از رابعہ بیگم

سوزِ دل

یارب یہ کیسا سانحہ جاں خراش ہے / دل جس سے چاک چاک جگر پاش پاش ہے
عالم تمام آنکھوں میں اندھیر ہو گیا / یک لخت کیوں یہ جینے سے جی سیر ہو گیا
مجموعۂ دل کو کس نے پریشان کر دیا / کیوں خانۂ امید کو ویران کر دیا
سر بارِ دوش ہے مرے اللہ کس لئے / دل پر خروش ہے مرے اللہ کس لئے
کیوں دل میں درد اٹھتا ہے رہ رہ کے بار بار / کیوں جیبِ الم سے گریباں ہے تار تار
دل جل رہا ہے سینہ کے اندر فغاں نہیں / آہیں فلک شگاف ہیں یہ کچھ دھواں نہیں
رہ رہ کے درد اٹھتا ہے بیتاب ہے جگر / آیا ہے دم لبوں پہ نکلتا نہیں مگر
سیلاب خون جاری ہے کیوں جوش گریہ سے / فرقت نے کس کی قلب کے ٹکڑے اڑا دیے
ہے ہے یہ کس جوان کا دائمی فراق ہے / یارائے ضبط طاقت صبر آج طاق ہے
وہ شمع جو کہ جلوہ دہ خاندان تھی / ہے ہے غضب کہ شام سے خاموش ہو گئی
وہ نونہال جس پہ چمن کو غرور تھا / ظالم خزاں کے ہاتھ سے پامال ہو گیا
اک نو شگفتہ پھول کو بے وقت اکھیڑا / دستِ اجل نے خاکِ فنا میں ملا دیا
کل تھا جو گلستان مسرت ہرا بھرا / اس کو خزاں نے لوٹ لیا کیا غضب کیا
ہے ہے غضب وہ مخزنِ امید لٹ گیا / وہ کاروان شہرت جاوید لٹ گیا
ہے ہے غروب ہو گیا وہ ماہ نیم ماہ / روشن تھی جس سے جان سکون یاب تھی نگاہ
وہ آفتاب اوج و بلندی کہاں گیا / جس کی شعاعیں لمعہ فگن تھیں ذرا ذرا
وہ تاج سروری مرے اللہ کیا ہوا / ہر فرد خاندان کا جو وجہ ناز تھا

وہ مر گیا کہ جیتے تھے ہم جس کو دیکھ کر — بچھڑا وہ جو تھا نور بصر قوت جگر

بو نصر ہائے تیری جدائی غضب غضب — یہ تیری موت ہم کو نہ آئی غضب غضب

فریاد کس کے پاس کروں آہ کیا کروں — دل پھٹ رہا ہے اے مرے اللہ کیا کروں

کچھ سوجھتا نہیں ہے زمانہ سیاہ ہے — حرماں نصیب بہنوں کا عالم تباہ ہے

دل کا سرور آنکھوں کا تارا کدھر گیا — اے آسماں وہ چاند ہمارا کدھر گیا

معدوم ہو وہ در نشیں وا مصیبتا — پیوند خاک ہو وہ نگیں وا مصیبتا

داماں چاک خاک بسر ساتھ ساتھ جاؤں — صاحب کدھر گیا ہیں کدھر ساتھ ساتھ جاؤں

ایسا عزیز خاک میں مل جائے ہے غضب — جان حزیں نہ تن سے نکل جائے ہے غضب

ترمیم کیوں ہوئی یہ ستم روزگار میں — لوٹا گیا چمن میرا فصل بہار میں

کیا فخر خاندان زمانہ سے اٹھ گیا — اک نازش جہان زمانہ سے اٹھ گیا

کیا وقیع کیا عزیز جہان تھا — کیا نیک کس طرح کا وہ صالح جوان تھا

روشن ضمیر مخلص و بے نفس و باصفا — اکثر صفات میں تھا وہ ہمرنگ اولیا

صالح تھا اور مصلح جمہور امور تھا — اقدام معصیت سے وہ بالکل ہی دور تھا

محبوب خلق اور مطیع خدا تھا وہ — بے لوث دوست ہمدم و درد آشنا تھا وہ

وہ یار باصفا نظر دوستاں میں تھا — اور ایک روح جسد خانداں میں تھا

بھائی کا یار بہنوں کا یاور تھا ہائے ہائے — اور وہ سکوں وہ دل مضطر تھا ہائے ہائے

پہچانتا تھا درد کو اظہار کے بغیر — حاجت روائی کرتا تھا انکار کے بغیر

رنجور کی وہ ہر شب کربت میں ساتھ تھا — اور دردمندوں کی مصیبت میں ساتھ تھا

بیوہ کا غمگسار یتیموں کا یار تھا — مجروح کوئی ہو جگر اس کا فگار تھا

محتاج کا معین تھا ہمدم علیل کا — سینہ میں اس کے ایک دل حق شناس تھا

چھوٹوں پہ مہرباں تھا بڑوں کا مطیع تھا — ہر طرح حسن خلق میں درجہ رفیع تھا

شاگرد تھا ذہین و اطاعت شعار وہ
استاد کا عزیز تھا اور ذی وقار وہ

تحصیل علم میں تھا خودی کو بھلائے وہ
رہتا تھا آہ رات کو بھی دن بنائے وہ

جب رات کو جہان پہ غلبہ ہو خواب کا
یہ کشتۂ حصول تھا محو مطالعہ

کس درجہ عز و شان پہ وہ جان دیتا تھا
کس درجہ حفظ آن پہ وہ جان دیتا تھا

بدنامی کے عوض میں تھا مرنا اسے قبول
ہے ہے یہی مراد ہوئی اس کی یاں حصول

سن اس کا گو کہ تھا ابھی چوبیس سال کا
وہ نیکنامیوں کے فلک پر پہنچ گیا

مجموعۂ صفات تھا لاریب بے گماں
اس نارسیدگی میں مکمل تھا وہ جواں

کس عالم شباب میں دنیا سے چل بسا
کیا نامراد ہائے شکار قضا ہوا

ظالم اجل نے اس کو مٹا ڈالا ہائے ہائے
مٹی میں آج اس کو ملا ڈالا ہائے ہائے

اے نور دیدہ یوں ترے مرنے کے دن نہ تھے
حسرت بھرے جہاں سے گزرنے کے دن نہ تھے

دنیا کی جلوہ گاہ پہ یوں رونما ہوئے
گویا کہ ایک سین طلسمی دکھا گئے

کھلنے نہ پائے تھے ابھی کملا کے رہ گئے
شاداب ہو رہے تھے کہ مرجھا کے رہ گئے

ہم کو ہنسا رہے تھے رلانے کے واسطے
ٹھنڈا رکھا تھا دل کو جلانے کے واسطے

شعبدہ باز تھا یہ رواں اک لئے ہوئے
افسانہ اپنے نام کا اک چھوڑ دیجئے

تم نیکنام زندہ رہے نامور گئے
افسوس ہم بھی ساتھ تمہارے نہ مر گئے

اے جان جاں یہ ہیں مصیبت زدہ تری
کس طرح سہہ سکیں گی کشاکش فراق کی

تیری اجل نے توڑ دیں کمریں ثبات کی
گرداب غم میں پھنس گئی کشتی حیات کی

اللہ یوں کسی کو ہراسا نہ کیجیو
آب حیات بخش کے پیاسا نہ کیجیو

دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے یہ دن کبھی
ہرگز پڑے کسی پہ نہ جو ہم پہ ہے پڑی

محنت کسی کی اس طرح سے رائگاں نہ جائے
دنیا سے اے خدا کوئی ایسا جواں نہ جائے

میرے عزیز میرے برادر مرے جواں
میرے عقیل میرے لئیق جہاں جواں

ماجب کلیجہ پھٹتا ہے بھائی میں کیا کروں — لوٹی گئی ہماری کمائی میں کیا کروں

وتے تھے بیقرار جو ہم بیقرار ہوں — روتے تھے زار زار جو ہم زار زار ہوں

لھ کو ہمارے جانتے تھے ہم سے پیشتر — خوش رکھنے کے خیال میں تھے غم سے پیشتر

ے میرے بھائی جان آج اک عالم ہے بیقرار — سوتے ہو کیسے چین سے تم یہ بہن نثار

لیا کچھ خفا ہوئے ہو کہ منہ کھولتے نہیں — اپنے فدائیوں سے بھی کچھ بولتے نہیں

کیا ہو گئی خطا جو یوں منہ موڑ کر چلے — بھائی بہن کو بے سروپا چھوڑ کر چلے

ہم روٹھتے تھے اور مناتے تھے تم ہمیں — پہلے تو یوں کبھی نہ ستاتے تھے تم ہمیں

گھبراتے تھے تم ہم کو پریشان دیکھکر — انجان کیوں ہو اب ہمیں حیران دیکھکر

دیکھو تو بھائی جان تمہاری ہیں خستہ حال — سر وار لوٹتا ہے زمیں پر شکستہ حال

کیسے وہ بیقرار ہیں زار و نزار ہیں — تم ان پہ تھے نثار وہ تم پر نثار ہیں

آپا کے اختلاج کا کچھ تم کو دھیان ہے — پیاری بہن تمہاری بہت نیم جان ہے

پھر دل کو ان کے دست تسلی سے تھام لو — باہیں گلے میں ڈال کے حسرت نکال دو

ہے ہے وہ نیم مردہ بہن کس طرح جئے — بازو پہ تیرے ہو تو بھروسے کئے ہوئے

تو چل بسا ولے تری حسرت ہر آن ہے — یہ سوز دل ہے جان میں جبتک کہ جان ہے

یارب اب اس حیات کا بھی سدباب ہو — مرنے میں دیر کیا ہے الٰہی شتاب ہو

ہر بار ر دوش ہے دل محزوں کو آہ آہ — اس بار سے رہائی ملے جلد یا الٰہ

بہنیں غریب خستہ جبیں نوجواں مرے — زندہ تو نیم جان ہیں کڑیل جواں مرے

تلقین صبر کرتے ہیں احباب و اقربا — کوئی بتا دے مجھ کو طریقہ ہے اس کا کیا

کس طرح تجھ کو صبر کیا جائے ہائے ہا — پتھر کا دل بھی ہو گر تو پس جائے ہائے ہا

آہن کو موم کر دے وہ صدمہ ہی جانگسل — پتھر کا دل نہیں ہے یہ دل ہے بشر کا دل

سولہ برس کی تیری شفقت کو بھول جائیں — یا اپنے تکان نقش محبت کو بھول جا

کیا صبر کیجے دورۂ ناحق شناس نے — کیا صبر کیجے دستِ فلکِ ناسپاس نے
محنت کا تیری پھل نہ دیا تجھ کو ہائے ہائے — بے مہری سے ہلاک کیا تجھ کو ہائے ہائے
ناشادکامیوں کو تری صبر کیجیے — یا نامرادیوں کو تری صبر کیجیے
کیا صبر ہو کہ آرزوئیں خاک میں ملیں — کیا صبر کیجیے کہ امیدیں فنا ہوئیں
کیا مرگِ نوجواں پہ تری صبر کیجیے — یا مرگِ ناگہاں پہ تری صبر کیجیے

چوبیس سال کی تری صحبت کو بھول جائیں — یا اس تری محبت و الفت کو بھول جائیں
کیا تیری نیکیوں کو سعادت کو بھول جائیں — یا پرخلوص تیری اطاعت کو بھول جائیں
ایثارِ بیکراں کو ترے بھول جائیے — خلقِ ملک نشاں کو ترے بھول جائیے
کس طرح صبر آئے کہ عاجز نواز تھے — کس طرح صبر آئے سراپا نیاز تھے

کیا صبر کیجے مہرِ سعادت ہوا غروب — کیا صبر کیجے ماہِ فتوت ہوا غروب
نالے جگر خراش ہیں اور سر پہ خاک ہے — دامانِ صبر اے مرے اللہ چاک ہے
خاموش رابعہ یہ ادب کا مقام ہے — حکمِ خدا پہ صبر و رضا تیرا کام ہے
خالق کے آگے شانِ عبودیت اب دکھا — ہاتھوں سے تھام دل سرِ تسلیم دے جھکا
بے سود ہے یہ آہ و فغاں نالہ و بکا — کر عاجزی کے ساتھ خدا سے یہ التجا

یا رب ریاضِ خلد میں اس کا مقام ہو — ہر لبن کے جام سے وہ شادکام ہو
قصرِ جناں میں بادۂ کوثر بہ ہاتھ ہو — غلمان و حور جلوہ کناں ساتھ ساتھ ہوں
جس طرح اس نے ہر متنفس کو شادماں — رکھا تھا اے خدا رہے وہ خود بھی کامراں
گو اس کا کوئی مونس و ہمدم نہیں رہا — رحمت تری امیں رہے اس کی یا خدا

الطاف خاص سے وہ ترے فیضیاب ہو
یا رب دعائے خستہ جگر مستجاب ہو

از ابو الفتح نصر اللہ برقی

حسرت ماتم

کیا جانئے سینہ میں لگی آگ کہاں ہائے
یہ آہ نہیں دل سے نکلتا ہے دھواں ہائے

دم پھرتا ہے گھبرایا ہوا سینہ میں اب کیوں
آتے ہیں لبوں تک تو بہت آہ و فغاں ہائے

پتھرا گئیں آنکھیں در و دیوار کی صورت
ڈھونڈوں میں تجھے اے مرے غمخوار کہاں ہائے

مرنے کے ترے دن تھے نہ اے جان برادر
ملجائے غضب خاک میں یوں تجھ سا جواں ہائے

صاحب! دل مضطر کو تسلی نہیں ہوتی
تصویر تو ہے تیری مگر تو ہے کہاں ہائے

تم کیا گئے بس ٹوٹ گئیں دل کی امیدیں
تم کیا گئے بس لے گئے سب تاب و تواں ہائے

برماتی ہیں دل کو وہ تری آخری نظریں
نشتر ہے کلیجہ میں وہ حسرت کا بیاں ہائے

ہم رہ گئے رونے کیلئے تم کو صد افسوس
تم اٹھ گئے حسرت لئے دنیا سے جواں ہائے

کیونکر تمھیں نیند آگئی اس سخت زمیں پہ
ہم نرم بچھونے پہ ہیں بے تاب و تواں ہائے

طے کر لئے سب مرحلے چوبیس برس میں
شبدیز ترقی پہ تھے سرعت سے رواں ہائے

محنت کا صلہ خوب دیا چرخ نے تم کو
آرام ہے تا حشر تمھیں اب مرے جاں ہائے

ممتاز تھے تم یونہیں زمانہ کی نظر میں
ممتاز نہ کرتی تمھیں مرگ ناگہاں ہائے

دو گز یہ زمیں مدفن اوصاف حسن ہے
اس خاک کے پردہ میں ہے حسرت کا جہاں ہائے (کتبۂ مزار)

اے وائے غضب تیری جواں مرگی پہ صد حسرت
بیساختہ چیخ اٹھتا ہے ہر پیر و جواں ہائے

وہ جوہر قابل وہ صفات اور وہ امیدیں
افسوس کہ اب ہو گئے سب وہم و گماں ہائے

برقی! مرے دل میں ہے ابھی حسرت ماتم
کیوں سوکھ گئے دیدۂ خوننابہ فشاں ہائے

از سید ابراہیم یداللہی[1]

اشکِ حسرت

کل سنی میں نے یہ صدا ناگاہ — آئیے جلد آئیے للہ
گھر سے آکر میں دیکھتا کیا ہوں — مضطرب پھر رہے ہیں نصر اللہ
دیکھ کر مجھ کو بولے ابراہیم — حال ابوالنصر کا بہت ہے تباہ
سن کے وحشت اثر خبر ان سے — میں پریشان ہو گیا واللہ
منہ سے بیساختہ مرے نکلا — کون ابوالنصر! ہائے فتح اللہ
اسی عالم میں مل کے دونوں نے — جنرل ہسپتال کی لی راہ
تھا میں ہیجو و تمام رستہ میں — ہوش مجھ کو نہ تھا خدا ہے گواہ

گو دواخانہ میں پہنچ تو گیا
لیکن اس وارڈ میں میں جا نہ سکا

بعد ازیں ہائے میں نے کیا دیکھا — بستر مرگ دوست کا دیکھا
اس کے چہرہ پہ مردنی دیکھی — خندہ رو جس کو بارہا دیکھا
جن کا پلکوں پہ نور پڑتا تھا — ایسی آنکھوں کو بے ضیا دیکھا
ہو گئی تھی زبان ایسی بند — سحر پرور جسے سدا دیکھا
ہاتھ پاؤں اس کے پائے بے حرکت — جس کو مشتاق کام کا دیکھا
اے ابوالنصر! تیرا یہ عالم — تھا مقدر میں دیکھنا دیکھا
دل شکن ہے بہت رواج قدیم — کیا کہیں اس کے بعد کیا دیکھا

---

[1] میرے برادرزادہ مولوی سید اشرف صاحب شمسی سابق پروفیسر نظامیہ کالج

کس قدر ہے جہاں میں اندھیر
ہائے یہ پھول اور یہ خاک کا ڈھیر

عمر چوبیس سال کی پائی — ہائے اس عمر میں یہ دانائی
ادب آموز تھی تری ہر بات — نہ تماشا نہ تو تماشائی
نوجوانان ملک و ملت کو — رہ ترقی کی تو نے دکھلائی
کون سا امتحان تھا جس میں — تیری کوشش ترے نہ کام آئی
تیری کوشش کی امتیازی شان — ہم کو بھی اے یتیم بھی نظر آئی
بعد ازیں بن گیا تو پی سی ایس — تیرے دل کی مراد بر آئی
منصفی جالنہ میں دے کے تجھے — کی حکومت نے قدر افزائی

تھی تری ملک و قوم کو حاجت
ہائے کس وقت تو نے کی رحلت

اے ابوالنصر خوش بیاں افسوس — تو ہوا اس طرح بے زباں افسوس
ہے زبانوں پہ نکتہ سنجوں کی — اے ادیب رموز داں افسوس
ذکر ہے تیری موت کا ہر سو — آہ و شیون یہاں وہاں افسوس
ہے یہ کس شان کی جواں مرگی — ہو رہا ہے کہاں کہاں افسوس
کف افسوس مل کے کہتا ہے — تیرے مرنے پہ اک جہاں افسوس
ہے تری موت خانداں کی موت — آہ! اے فخر خانداں افسوس
اقربا تیرے تجھ پہ نازاں تھے — نہ کریں کیوں یہ خستہ جاں افسوس

آج اگر ہوتے حضرت روحی
حالت اس غم سے ان کی کیا ہوتی

چھیڑتا ہوں میں جب ترا قصہ — ختم کرنے کو جی نہیں ہوتا

حیرت انگیز داستاں تیری | عبرت آموز تذکرہ تیرا
اے ابو نصر تیرے مرنے سے | انقلابات ہو گئے کیا کیا
ہم وہی ہیں مگر ہمارے لئے | باغ عالم کی وہ نہیں ہے فضا
مٹ کے تو نے مٹا دیا ہم کو | اب کہاں ہے وہ ولولہ دل کا
کیوں نہ قائل ہوں میں ترا۔ تو نے | بھائیوں کی طرح مجھے سمجھا
ہیں صفات حمیدہ کو تیری | اپنے دل سے بھلا نہیں سکتا

دوست ایسا کہاں سے لاؤں میں
ہمدم اپنا کسے بناؤں میں

جان غم میں ترے گھلاتا ہوں | لطف آہ و بکا میں پاتا ہوں
تیرے دیوانخانہ میں اکثر | تیرے بھائی سے ملنے جاتا ہوں
اور بھی دوست تیرے آتے ہیں | اپنا مونس انھیں بناتا ہوں
ان سے سنتا ہوں داستاں تیری | ان کو قصے ترے سناتا ہوں
ہنس کے خود تو جہاں ہنساتا تھا | رو کے اب میں وہاں رلاتا ہوں
کبھی تکتا ہوں دوسروں کا منہ | اپنی گردن کبھی جھکاتا ہوں
قابل قدر داغ فرقت ہے | اس کو میں دل سے کب مٹاتا ہوں

کچھ تو صورت بنے تسلی کی
تو نہیں تیری یادگار سہی

تجھے کہتے نہیں ہمیں اچھا | بلکہ سب کہتے ہیں نکتہ چیں اچھا
تجھ میں اے دوست یہ تو وصف نہ تھا | کہ برا ہو کہیں۔ کہیں اچھا
تیرے احباب تھے ترے مداح | جان کر تجھ کو بالیقیں اچھا
انس تجھ کو بروں سے تھا ہی نہیں | تھا ہر اک تیرا ہمنشیں اچھا

تجھ سے واقف نہ تھے عدم والے — پھر بھی تو جا بسا وہیں اچھا
جان تڑپے ہماری یونہی خیر — یوں ہی تڑپے دل حزیں اچھا
جاگ بے وقت سونیوالے جاگ — خواب بے وقت کا نہیں اچھا
وقت کی قدر کرنے والے جاگ
امتحانوں سے ڈرنیوالے جاگ

تضمین

دل من خستہ و حالم زبون است — سر آشفتہ عقل ذو فنون است
شکیب از جان پر دردم بعید است — سکونم کمتر و دردم فزون است
عزیزاں را دل از بہر تو خوں است
دل خویشاں نمی دانم کہ چوں است

از جناب سید خوند میر صاحب مستین

قطعۂ تاریخ رحلت

ابن احمد آہ فتح اللہ ایچ۔سی۔ایس کہ بود — در سن بست و چہارم زیں سرا بگرفت راہ
بر کنار رود موسیٰ دفن شد سہ شنبہ روز — ششمیں و شانزدہ افسوس بودہ آہ! آہ

۱۳۴۸ھ

کلامِ سروش

مُرتبہ

ابوظفر عون اللہ

تبصرہ

میرے برادر عزیز ابوالنصر فتح اللہ بی۔ اے بی۔ سی یس کی مرگ ناگہانی نے نہ صرف مرحوم کے عزیز و اقارب دوست احباب بلکہ اغیار کو بھی خون کے آنسو رلائے۔ اس کی موت ایک ہونہار قابل اور سراپا خلق نوجوان کی موت کی حیثیت سے اب تک تعلیم یافتہ طبقہ میں یادگار ہے۔ لیکن بہت کم لوگ حتیٰ کہ مرحوم کے خاص دوست بھی اس بات سے واقف نہیں کہ مرحوم کو شعر وسخن میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اور اس قلیل سی مدت میں جو حاملان قضا و قدر نے اس کے لئے مقسوم کی تھی وہ شاعری کے ایک مرتبہ پر پہنچ چکا تھا۔

مرحوم نے تخلص سروش اختیار کیا تھا اور کچھ نظمیں جناب وحیدالدین صاحب سلیم مرحوم کو بغرض اصلاح دکھائی تھیں۔

سروش کو علم ادب سے خاص مناسبت تھی اور رموز شاعری سے واقفیت کلی رکھتا تھا لیکن اسے مشاغل کی فراوانی نے شاعرانہ ذوق وشوق کی تکمیل کے لئے بہت کم وقت صرف کرنے کا موقع دیا۔ بایں ہمہ سروش نے تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی تھی۔ اور جو کچھ لکھا ہے وہ اس معیار کا کلام ہے کہ اگر مستند اساتذہ کے کلام کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے تو کسی حیثیت سے کم درجہ نہ رہے گا۔ اس کا کلام پختہ مشق ماہرین فن کے کلام کیساتھ ٹکر کھاتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مرحوم ایک بڑا آدمی تھا۔ لیکن میرا یہ کہنا خالی از مبالغہ ہے کہ اس میں بڑے آدمی کے آثار موجود تھے۔ سروش بڑا شاعر تو نہیں تھا لیکن اس میں بڑے شاعر کی نشانیاں ضرور پائی جاتی ہیں۔

ہم یہاں اس کے کلام کا کچھ حصہ ناظرین کے ملاحظہ میں پیش کرتے ہیں۔

فطرت پرست شاعر کے نزدیک گوشۂ عزلت ہو کہ سیر دریا ہر جگہ دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

سو مجالس ہیں کنج عزلت میں　　لاکھ نغمے ہیں شور دریا میں
سن نوائے سرودن فطرت　　ریزش آبشار و دریا میں

جدت ادا نے ان پامال اور فرسودہ مضامین میں کیا لطف پیدا کر دیا ہے۔

شیخ آخر کو بات چھپ نہ سکی　　کتنے مضمون تھے لغزش پا میں
شغل ہے چاک گریباں کا اچھا لیکن　　آج کا دن تو گذر جائیگا کل کیا کیجو
حال دل ہر چند ہے ناگفتنی　　تم اگر پوچھو تو بتلاتے ہیں ہم

الم پرستی سروش کی طبیعت کا ایک خاص رنگ تھا۔ کہیں کہیں اشعار میں بھی عجب پُر سوز انداز میں اس کا اظہار ہوا ہے۔

کیوں مجھے اتنا الم دوست بنایا یا رب　　میرے ہنسنے میں بھی اک غم کی ادا ہوتی ہے
ایسی رک رک کے نکلتی ہے فغاں سینہ سے　　جیسے اک ساز شکستہ کی صدا ہوتی ہے

یہ قطعہ بھی ان ہی جذبات کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔

ہر شب ہے یہی حضرت باری سے دعا　　یا رب یہی شب میرے لئے آخر ہو
اب سوؤں تو سوؤں میں الٰہی ایسا　　ہنگامۂ محشر ہی جگائے مجھ کو
ہیہات مگر صبح قیامت کے بجائے　　ہر دن وہی خورشید نظر آتا ہے
اور ہنستی ہر غم کے تسلسل کا مری　　دل کو مرے پیغام سنا جاتا ہے

غزل میں بہت زیادہ پر لطف معاملہ بندی ہے۔ اس کو بھی کس خوبی سے باندھا ہے۔

دل ادھر صرف تمنا ہے کہ برسن ہو کچھ　　وہ ادھر محو تغافل ہے کہ تڑپا کیجے

لطف دیتی ہیں مگر نئی ادائیں کیا کیا　　　جی میں آتا ہے کہ پھر شکوہ بجا کیجے

سرورؔش کے مجموعہ کلام میں مسلسل نظمیں ایک امتیازی شان رکھتی ہیں۔ خیالات کا تسلسل اسلوب بیان کی ندرت۔ جذبات کی مصوری۔ مضامین کا تنوع اور سب سے زیادہ اسٹائل کی بے ساختگی وہ خاص خوبیاں ہیں جن سے ہر نظم آراستہ ہے۔

شاعر تنہا اپنے خیالات میں غرق ایک کنج میں بیٹھا ہوا ہے چاروں طرف عالم خاموشی ہے کہ ایک "طائر جادو نوا" کی تانیں اس سرست کو چونکا دیتی ہیں اور وہ فطرت کی اداؤں کا عاشق اس "مطرب سحر آفریں" کے نغمہ میں کھو جاتا ہے اور جب ذرا اس طوفان نشاط میں کمی ہوتی ہے تو اوس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ اے کاش میں بھی ایک طائر ہوتا اور اسی طرح سننے والوں کو مست و بیخود بنا دیتا اور وہ اس طرح طائر سے خطاب کرتا ہے۔

مجھ کو سکھا دے اے پری　　　یہ سوز یہ طرز فغاں
یہ سحر یہ بے خودگری　　　سنکر جسے سارا جہاں
ہو جائے بیخود اس طرح جیسے ہوش کھویا ہو

نصف سے زیادہ شب آچکی ہے ماہ تاباں نے اپنی شعاعوں سے تمام دنیا کو بقعہ نور بنا دیا ہے۔ "نوعروس فلک" نگہائے انجم سے آراستہ ہے زمین و آسمان بادہ راحت کے نشہ میں چور ہیں۔ لیکن شاعر جس کی زندگی ایک اضطراب ہے جس کی ہر رات بیتابیوں کے لئے وقف ہے۔ خدا جانے کن جذبات سے بے کیف ہو کر کہہ اٹھتا ہے

مادر فطرت نے پھونکا ہر طرف افسون خواب　　　قلب شوریدہ مگر اب بھی ہے وقف اضطراب

ہائے کیسی درد و الم کی تصویر ہے۔ اندھیری رات اور وہ بھی موسم برسات کی۔ سناٹا اس غضب کا کہ پتہ ہلنے کی صدا دور دور تک سنائی دے۔ دنیا اور تمام دنیا والے خواب آرام میں محو ہیں لیکن ایک "سانورستی" اپنے سجن کی یاد "میں کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹ رہی ہے۔ اس سناٹے میں وہ صرف اپنے کپڑوں کی صدا سن سکتی ہے جو عالم اضطراب میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

ہے رات اندھیری برکھا کی چھایا ہے غضب کا سناٹا

سوتا ہے فلک غافل ہے زمیں پُرہول ہے شب کا سناٹا

میں جاگ رہی ہوں بے کل ہوں آتی ہے مرے کپڑوں کی صدا

بہار کی آمد نے فرش زمیں کو عروس نو کی دلآویزیاں بخش دی ہیں اور طائروں کے سریلے نغمے کونسا دل ہے جس پر ایک وجدانی کیفیت طاری نہیں کرتے لیکن ایک بیت کی ماری برہن کی زبان سے سن لو کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔

پھر دھرتی پر اک جوبن ہے پھر آئی ہے رت ساون کی

پھر مور پپیہے بولتے ہیں پھر چنتا بڑھتی ہے من کی

پھر ساون واپس آیا ہے اب واپس آجاؤ تم بھی

آہ اگر ظالم موت اس کو مہلت دیتی تو وہ نامور شعرا کی مجلس میں ممتاز جگہ حاصل کرتا۔ افسوس کہ مرحوم بے وقت شکار اجل ہوا "غنچۂ استعدادش ناشگفتہ ماند"۔ حیف صد حیف کہ بہت جلد زمانہ نے اس کے جوہر قابل کو خاک میں ملا دیا۔ اسکا مختصر مجموعۂ کلام گو بہت نامکمل ہے مگر مرحوم کی ناتمام زندگی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے بہت کافی ہے۔

ابو الفتح نصر اللہ
مورخہ ۲۲ خورداد ۱۳۳۹ف

غزلیات

عہد ترک عاشقی کرتے ہیں پھر | آج پھر جھوٹی قسم کھاتے ہیں ہم
حال دل ہر چند ہے ناگفتنی | تم اگر پوچھو تو بتلاتے ہیں ہم
بیٹھے ہیں اغیار میں وہ بے حجاب | لطف تو دیکھو کہ شرماتے ہیں ہم
ہو گئے حضرت بھی اس کے شیفتہ | اب تو خود ناصح کو سمجھاتے ہیں ہم

مصرعۂ طرح :- کہہ تو بیکار کیا ہے دنیا میں

ایک لذت ہے سیر دریا میں | اک تماشا ہے کوہ و صحرا میں
سو مجالس ہیں کنج عزلت میں | لاکھ نغمے ہیں شور دریا میں
ص ″ ″ ″ ″ | ″ قعر ″ ″
من نوائے سرود فطرت | خندۂ آبشار و دریا میں
ص ″ ″ سرود اے غافل | ″ ریزش ″ ″ ″
دیکھ نیرنگ صنعت انساں | صفحۂ پردۂ سینما میں
ذرہ ذرہ ہے یاں سبق آموز | کہہ تو بیکار کیا ہے دنیا میں
ہنس نہ سنکر ہزار مضموں ہے | نالۂ عندلیب شیدا میں
شیخ آخر کو بات چھپ نہ سکی | کتنے مضموں تھے لغزش پا میں
ض کل تھا ساقی پہ عالم مستی | ″ ″ ″ ″

ع۔ بھائی مرحوم نے سلیم صاحب سے اصلاح لی تھی جن اشعار پر اصلاح دیگئی ہے ان پر میں نے "ص" بنا دیا ہے۔

اتنا ڈوبا کہ فرق کچھ نہ رہا — ان کے وعدہ میں میری توبہ میں
زاہد خشک اور رقص و سرود — کتنی کیفیتیں ہیں صہبا میں
ہم تو ڈھونڈ ہی گئے وہ ملے نہ ملے — لطف مضمر ہے سعیِ بیجا میں

ہم بھلا کب کسی کو کہتے تھے — اپنی ہی بے بسی کو کہتے ہیں
ص 〃 برا 〃 〃 〃 — 〃 〃 〃 〃 〃
یہ جو میٹھا سا درد ہے دل میں — کیا محبت اسی کو کہتے ہیں
میرے رونے کا نام ہے بارش — برق اُن کی ہنسی کو کہتے ہیں
بعد ناکامی یہ کھلا تقدیر — عقل کی بے بسی کو کہتے ہیں
پوچھتا کیا ہے حالِ دل ہمدم — عشق سوزِ دلی کو کہتے ہیں
ہے فلک سے گلہ غلط ہم تو — دل مضطر تجھی کو کہتے ہیں
ص یہ جو کہتے ہیں برق یا سیماب — 〃 〃 〃 〃 〃
دل لگی کچھ نہیں لگانا دل — درد دل کی لگی کو کہتے ہیں
عشق میں عرض مدعا کے لئے — گفتگو خامشی کو کہتے ہیں
سچ اگر ہم سے پوچھئے تو حیات — غم فردا و دی کو کہتے ہیں
بے عمل جو ہے وہ نہیں زندہ — کشمکش زندگی کو کہتے ہیں

اغیار کی جانب کہیں اٹھے نہ نظر دیکھ — صدقے تری آنکھوں کے ادھر دیکھ ادھر دیکھ
جانا وہ غفلت مرے نالوں کی صدا سن — بیگانۂ الفت مری آہوں کا اثر دیکھ
اغیار کی فریاد کی تاثیر تو دیکھی — ہم ضبط فغاں کرتے ہیں اس کا بھی اثر دیکھ
دن رات گزرتے ہیں تری یاد میں کیونکر — اے غیرتِ خورشید [illegible] رشکِ قمر دیکھ
قابل نہیں کہنے کی مری بات مگر سن — لائق نہیں سننے [illegible] حال مگر دیکھ

کہتے ہیں کہ بیمار ہے بیمار محبت — حیلہ ہے بہانہ ہے ذرا ایک نظر دیکھ

گیا دلبر سے اک تیر نگاہ ناز دلبر سے — گئے ہم ہیرے شمشیر تغافل ہائے ہمسر سے
نہاں سینے میں میرے گر نہیں ہے آتش فرقت — تو کیوں آنسو نکلتے ہیں مری آنکھوں سے اخگر سے
قمر نے روشنی خورشید عالمتاب سے لی ہے — اڑالی خور نے آب و تاب کس کے روئے انور سے
گنہگار محبت قتل ہوتے ہیں تماشا ہے — مری جاں تم بھی تو دیکھو نکل آؤ ذرا گھر سے
گیا مجنوں کا دورہ پوچھ لے اب دشت میں جا کر — مرے عہد جنوں کی داستاں ایک ایک پتھر سے
سراسر ہم ہوے رسوا دل مضطر کے ہاتھوں سے — فلک سے اب شکایت کیا گلہ کیسا مقدر سے

کیوں مجھے اتنا الم دوست بنایا یارب — میرے ہنسنے میں بھی اک غم کی ادا ہوتی ہے
ایسی رک رک کے نکلتی ہے فغاں سینے سے — جیسے اک ساز شکستہ کی صدا ہوتی ہے
اس پہ تقریر فدا اس پہ فصاحت قرباں — خامشی اہل محبت کی بھی کیا ہوتی ہے
یہ تو ممکن ہے کہ دل مجھ سے جدا ہو جائے — پر کہیں دل سے تری یاد جدا ہوتی ہے
داستاں اپنی جوانی کی سنا اے واعظ — اب تو پیری میں بہت یاد خدا ہوتی ہے
پھر یہ موسے سر طور الجھنا کیسا — جب تجلی ہی تری ہوش ربا ہوتی ہے
التجا اہل تماشا کی ہے تجھ سے بے سود — خود نمائی تری خود پردہ کشا ہوتی ہے
ہے بلاغت تری ترکیب بدن پر قرباں — شاعری تیری نزاکت پہ فدا ہوتی ہے
حال کھل جائیگا رندوں پہ ترا اے زاہد — دیکھ غماز بڑی لغزش پا ہوتی ہے

ہے خموشی ہی سروش اس کیلئے کچھ موزوں
بات دل کی کہیں لفظوں میں ادا ہوتی ہے

چشمِ پر شوق کو محوِ رخِ زیبا کیجے — جگرِ خوں شدہ کو صرفِ تمنا کیجے
شرم کہتی ہے کہ تا چند تقاضا کیجے — شوق کہتا ہے کہ پھر عرضِ تمنا کیجے
دل اِدھر وقفِ تقاضا ہے کہ برمن ہگے — وہ اُدھر محوِ تغافل ہے کہ تڑپا کیجے
جی میں آتا ہے لگا دیجئے آگ عالم کو — اک نظامِ فلکی اور ہی پیدا کیجے
ص 〃 〃 〃 〃 〃 اس دہر کو آگ — 〃 〃 〃 〃 〃 〃

دل میں اپنے بھی نہاں ہے اثرِ سوز و گداز — شمع کی طرح یہ کیا فرض کہ جی پر جا کیجے
ص 〃 〃 〃 〃 〃 〃 — 〃 〃 〃 مگر کس لئے 〃

واہ کیا ابر ہے کیا بادِ صبا کیا برسات — آج خالی خم و پیمانہ و مینا کیجے
ص 〃 〃 〃 〃 موجِ ہوا 〃 — 〃 〃 〃 〃 〃 〃

شیخ جی آپ بھی واللہ غضب ڈھاتے ہیں — رند اور توبۂ صہبا اجی تو بات کیجے
ص 〃 〃 〃 〃 〃 — 〃 〃 جام سے توبہ 〃 〃

لطف دیتی ہیں بگڑنے کی ادائیں کیا کیا — جی میں آتا ہے کہ پھر شکوۂ بیجا کیجے
چارہ گر سر بگریباں ہے پشیماں ہے طبیب — میری جاں آپ ہی اب دل کا مداوا کیجے
شغل ہے چاک گریبانی کا اچھا لیکن — آج کا دن تو گذر جائیگا کل کیا کیجے
آپ کو وحشیٔ زندانِ جنوں سے کیا کام — آپ گیسوئے مسلسل کو سنوارا کیجے
ہم تو اس نرگسِ مخمور کے شیدائی ہیں — آپ تعریفِ گلِ نرگسِ شہلا کیجے
شمعِ خورشید بجھا دیجئے آہِ دل سے — شعلۂ عشق سے دنیا میں اجالا کیجے

قطعات

یہ نظم خالہ جان (خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ) کے حج کو جانے کے وقت لکھی گئی تھی

دیکھو رحمت کی وہ گھٹا چھائی — رنگ لایا سپہرِ مینائی

اس کی رحمت بشارتِ دیدار — طالبِ وصل کے لئے لائی
لیجئے آپ کو مبارک ہو — آپ نے آرزوئے دل پائی
جس کے دیدار کی تمنا تھی — اُس کے کوچہ کی راہ ہاتھ آئی
جائیے! جائیے!! سدھاریے آپ — ہو مبارک یہ گام فرسائی
ہو مبارک سیاحتِ دریا — ہو مبارک فضائے صحرائی
ہو مبارک زیارتِ حرمین — وصلِ محبوب کے تمنائی
آپ جاتے ہیں اس مقام پر آج — خاک جس کی ہے کحلِ بینائی
نام ہے اس دیارِ عالی کا — مایۂ عز و نازِ گویائی
آپ سے التجا ہماری ہے — اے دیارِ عرب کے شیدائی
جب کہ درگاہِ خاص میں جا کر — آپ ہوں محوِ جبہہ فرسائی
کیجئے اس گھڑی خدا کے لئے — ہم غریبوں کی یاد فرمائی
گرچہ ہے شاق آپ کی فرقت — گرچہ دشوار ہے شکیبائی
تھام کر دل مگر یہ کہتے ہیں — یک زباں ہو کے ہم بہن بھائی

بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و باز آئی

گلہ

ہم پہ اگلی سی عنایات نہیں — کیا ہوئی بات کہ وہ بات نہیں
کیا وہ اب گردشِ دوراں نہ رہی — کیا وہ اب پہلے سے ذرات نہیں
کیا وہ اب نیر و اختر نہ رہے — کیا وہ اب ارض و سماوات نہیں
کیا وجہ ہے کہ وہ اب "تم" نہ رہے — کیا وجہ ہے کہ وہ حالات نہیں

یا شب و روز تھا آنا جانا | یا حسینوں سے ملاقات نہیں
یا محبت کے تھے لاکھوں پیاں | یا عداوت کی بھی اک بات نہیں
ہے یہ اظہار حقیقت ورنہ | مجھ کو منظور شکایات نہیں
جو گذرتی ہے وہی لکھتا ہوں | میرے اشعار خیالات نہیں

دردِ دل کس سے بیاں کیجیے سروش
کوئی مستفسر حالات نہیں

بچپن اور جوانی

ہائے وہ دن وہ مرا طفل دبستاں ہونا | لوح ہاتھوں میں اور آغوش میں جزداں ہونا
ساتھ ہم درسوں کے اپنے وہ شرارت کرنا | پھر وہ استاد کے دھمکانے سے ترساں ہونا
کبھی مکتب سے نکل جانا سحر البطر | کبھی صحن چمنستاں میں خراماں ہونا
تتلیوں کی کبھی پرواز کا پیچھا کرنا | بھنبھنانے سے بھنور کے کبھی ترساں ہونا
ساتھ بلبل کے کبھی نغمہ سرائی کرنا | گل خنداں کو کبھی دیکھ کے خنداں ہونا
اسپ چوبیں پہ وہ تن تن کے سواری کرنا | بن کے رستم وہ سر لشکر ایراں ہونا
لیکے احباب کو دربار سجانا لاکھوں | کبھی ہرقل کبھی قیصر کبھی خاقاں ہونا
الغرض عیش و مسرت سے گذرتی تھی مری | مجھ کو معلوم نہ تھا کیا ہے پریشاں ہونا
پھر شش میری تباہی کا زمانہ آنا | عاقبت میرا اسیر غم پنہاں ہونا
سر پہ آغاز جوانی کا نشہ چڑھ جانا | دل میں فانوس محبت کا فروزاں ہونا
سر کا آماجگہ وحشت و سودا بننا | دل کا مہماں کدۂ حسرت و ارماں ہونا

دل میں ہر لحظہ نئی وضع کے جلوے آنے / یعنے اس خانۂ ویراں کا پریشاں ہونا
نقد دل دے کے مرا جنس محبت لینا / جان کھونے کے لئے بندۂ جاناں ہونا
دھیرے دھیرے مری حالت کا بگڑتا جانا / رفتہ رفتہ مرا سر گشتہ و حیراں ہونا
شکل آئینہ کبھی صورت حیرت رہنا / کبھی جوں شانہ سر انگشت بدنداں ہونا
چشم بیمار کے مانند کبھی اٹھ جانا / کبھی آنسو کی طرح خاک پہ غلطاں ہونا
کبھی بلبل کی طرح نوحہ سرائی کرنا / اور کبھی گل کی طرح چاک گریباں ہونا
ع دل کی حالت کو کبھی دیکھ کے رو پڑنا / اپنے رونے پہ کبھی آپ ہی خنداں ہونا

یہ زمانہ بھی گزر جائے گا اک روز سروش
کیوں کہ لازم ہے یہاں گردش دوراں ہونا

چاندنی رات

ہے شب مہتاب میں جلوہ چراغ طور کا / چھا رہا ہے ہر طرف عالم یہ عالم نور کا
نور کی موجیں رواں ہیں آسماں پر چارسو / چاند سر چشمہ ہے گویا آبشار نور کا
چاندنی ہے یا ہے بحر پر سکوں سیماب کا / یا زمیں پر فرش ہے اک چادر بلور کا
اتصال تیرگی و نور ہے حد نگاہ / ہے یہ دو رنگی دوپٹہ کس بہشتی حور کا

شعلۂ بارد ہے رقصاں پرتو مہتاب میں
اک جہان حسن ہے اس نور کے سیلاب میں

کل جہاں خاموش ہے کون و مکاں خاموش ہے / بادۂ آرام سے ارض و سما مدہوش ہے

ع اس شعر کے بعد چار اشعار کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ شاید پر کرنیکا خیال تھا۔ افسوس! عمر نے دھوکا دیا

یہ زمیں خاموش ہے وہ آسماں خاموش ہے   بادۂ راحت سے سب کون و مکاں مدہوش ہے
ہیں ستارے آسماں پر ہر طرف بکھرے ہوئے   نو عروس چرخ گویا سر بسر گلپوش ہے
عندلیبوں کی ترنم ریزیاں اب ہو چکیں   محفل قدرت بیاں گل سراپا گوش ہے
ساز ہستی کی تلاطم خیزیاں اب مٹ گئیں   بربط عالم سے پیدا نغمۂ خاموش ہے

مادر فطرت نے پھونکا ہر طرف افسون خواب
قلب شوریدہ مگر اب بھی ہے وقف اضطراب

ہر شب ہے یہی حضرت باری سے دعا   یارب یہی شب میرے لئے آخر ہو
اب سوؤں تو سوؤں میں الٰہی ایسا   ہنگامۂ محشر ہی جگائے مجھکو

ہیہات مگر صبح قیامت کی بجائے   ہر دن وہی خورشید نظر آتا ہے
اور ہستی پر غم کے تسلسل کا مری   دل کو مرے پیغام سنا جاتا ہے

سچ ہے وہی ہوتا ہے جو خالق چاہے   ہے ہستی انساں سراسر مجبور
تسلیم و رضا ہی سے ہے بندہ بندہ   ناشکری ہے آئین عبادت سے دور

میں آج اگر صابر و شاکر ہوتا   یوں مضطرب الحال نہ ہوتا ہرگز
ہنگامۂ ہستی پہ نہ ہنستا شاید   ہر امن و سکوں کو تو نہ روتا ہرگز

کب تک رہے تقدیر کا رونا دھونا
اللہ سکھا دے مجھے بندہ ہونا

کتنے پژمردہ ہیں غنچے چمنستاں میں مرے   کھل کھلا دوں میں انھیں باد صبا ہو جاؤں
بزم ماتم میں بھی پیغام مسرت لاؤں   غم کو مفقود کروں درد ربا ہو جاؤں
میں صدا نالۂ مظلوم کو سن کر دوں داد   اور ظالم کے لئے جور و جفا ہو جاؤں
لاکھ پردوں میں بھی معلوم کروں رمز حیات   کاشف راز بنوں پردہ کشا ہو جاؤں

بہے جائے سمندر کس تحمل سے رواں تو ہے
بہے جا ہاں بہے جائے سمندر بیکراں تو ہے

زمیں پہ کبر و نخوت کے نشاں انساں بناتا ہے
مگر اقلیم آبی کا ازل سے حکمراں تو ہے

ہزاروں بادباں تیرے تلاطم نے ڈبوئے ہیں
کروڑوں کشتیوں کی ایک قبر بے نشاں تو ہے

تضمین

خدائے حسن شد ۔ بندہ فدائے حسن و جمال
کیا جو بوسہ رخسار آتشیں کا سوال

تو ہنس کے دیں مری گردنیں اپنی باہیں ڈال
خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال

کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

کسی[1] سے اب سر مغرب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
کنارے حوض کے بیٹھے ہوئے باتیں نہیں ہوتیں

وہ کیا دن تھے گذر جاتی تھی آدھی رات باتوں میں
الٰہی مختصر اب اسقدر راتیں نہیں ہوتیں

فروغ جلوۂ عید الضحیٰ مبارک ہو
جمال دلبر رنگیں ادا مبارک ہو

دعا سروش کی ہے یہ بصد خلوص و نیاز
کہ یہ دوگونہ مسرت سدا مبارک ہو

اے سرو گلستان وفا عید مبارک
اے شمع شبستان حیا عید مبارک

اے عیش دل و جان مرے جان و دل عیش
اے عید ز تو عیش فزا عید مبارک

[2] وہ دلکشی و ادا کی دیوی
وہ پریت کی وہ وفا کی دیوی

---

[1] احمد حسین کو سیول سروس ہونے سے لکھی تھی۔
[2] کس کو مخاطب کیا ہے علم نہیں۔

جس وقت کہ عید ملنے آئے — انداز و ادا سے سر جھکائے
آنکھوں میں ہزار شوخیاں ہوں — چتون سے شرارتیں عیاں ہوں
اس وقت مجھے بھی یاد کرنا

لوگ کہتے ہیں عید آئی ہے — قفل غم کی کلید آئی ہے
لیکن اے ماہ عید تیرے بغیر — عید کیسی کہاں کی عید کی سیر
عید کیسی جو تم وطن میں نہیں — لطف کیا گل اگر چمن میں نہیں
. . . . — عید کیسی جو تم گلے نہ ملے

الغرض عید موجب غم ہے
عید میرے لئے محرم ہے

کمال عشق

"انا لیلیٰ! انا لیلیٰ" !! کہا تو نے تو کیا مجنوں — کرشمہ اک تری دیوانگی کا وہ بھی تھا مجنوں
کمال عشق ہم تسلیم کرتے جب ترا مجنوں — کہ خود لیلیٰ پکار اٹھتی "انا مجنوں انا مجنوں"

منظوم خط و کتابت

کاچیگوڑہ میں قاصدا یہ خط — بہ درِ دولت منتیں پہونچا

یہ نظم میں نے احمد حسین سے لی ہے چند اشعار درمیان میں چھوٹ گئے ہیں جو احمد حسین کو یاد نہیں رہے

آج دو بجکے دس منٹ کے بعد
تو جبہ آری یہ کمترین پہونچا

دوسرا خط جناب والا کا
پیش اجلاس اولیں پہونچا

پہلے نامہ کا دیچکا ہوں جواب
کیا جواب آپ کو نہیں پہونچا

پتہ:- دیوانی بلدہ صیغہ تعمیل میں یہ خط
پہونچا دے قاصدا تو جناب منتیں کے پاس

ہے دوسرا یہ نامہ والا جناب من
صادر ہوا ہے آج جو اس کمترین کے پاس

پچھم کے اونچے پربت سے
جب شام اتر کر آتی ہے

ہر سمت اندھیرا پھیلتا ہے
ہر سمت خموشی چھائی ہے

اسوقت تمہاری یاد مرے سینہ میں آگ لگاتی ہے

جب تم نے کہا میں جاتا ہوں
پردیس میں کچھ دن رہنے کو

کچھ دیر تو میں خاموش رہی
پھر ہاں بھی کہدیا کہنے کو

کیا مجھ کو خبر تھی فرقت کی میں کمسن بھولی بھالی تھی

پردیس میں جاکر بھول گئے
تم برسوں اس برہن کو

جو آگ لگی ہے سینہ میں
اک روز جلا دیگی من کو

جب ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں بڑھتی ہے اور جلن دل کی

پھر دھرتی پر اک جوبن ہے
پھر آئی ہے رت ساون کی

پھر بوٹے پھولے ہوتے ہیں
پھر نینا برستی ہے [illegible]

پھر ساون واپس آیا اب واپس آجاؤ تم بھی

جو میری دوسری سکھیاں ہیں
باغوں میں کلیاں چنتی ہیں

جھولوں پر ساون گاتی ہیں
کوئل کی تانیں سنتی ہیں

میں گھر میں چپ کی بیٹھی ہوں خاموشی ہے تنہائی ہے

اتنی نظم ان کی ایک ڈائری میں سے ملی۔ ایک دوسرے کاغذ پر یہ لکھا ہوا ملا معلوم نہیں سلسلہ ہے یا نہیں۔

جو میری دوسری سکھیاں ہیں — باغوں میں جھولے ڈالے ہیں
ساون کے نغمے گاتی ہیں — گودی میں ننھے بالے ہیں
میں پھول اکیلی چنتی ہوں لگ جائے آگ گلستاں کو

پردیس سدھارے تم جب سے — گھر میرے بہار نہیں آئی
پھولوں سے مجھے نفرت سی رہی — کوئل کی پکار نہیں بھائی
گھر میرا اجڑا گلشن ہے دن رات جہاں تنہائی ہے

میں اچھی چیزیں لایا ہوں — ساون نے آکر مجھ سے کہا
حیرت سے یہ میں نے بات سنی — پھر جلدی سے منہ پھیر لیا
تم جھوٹی خبر بے اصل بیاں ایسے مرے نیک نصیب کہاں

ہے رات اندھیری برکھا کی — چھایا ہے غضب کا سناٹا
سوتا ہے فلک غافل ہے زمیں — پر ہول ہے شب کا سناٹا
میں جاگ رہی ہوں بے کل ہوں آتی ہے مرے کیڑوں کی صدا

بے سود یہ میرا رونا ہے — بے کار مرا غم کرنا ہے
اب چاند کی جانب دیکھتی ہوں — بے صرفہ یہ آہیں بھرنا ہے
اب[عه] چاند کی جانب دیکھتی ہوں شاید یونہی نیند آجائے مجھے

عه اس بند میں تیسرا مصرعہ اور ٹیپ کے مصرعہ کا ابتدائی حصہ ایک ہی ہے شاید اصلاح کا ارادہ تھا مگر افسوس کہ موت نے کوئی خیال پورا ہونے نہیں دیا۔

سکھ چین سے دنیا میں رہنا — میں چاہوں تو کچھ دشوار نہیں
یا جان ہی اپنی کھو دینا — میں چاہوں تو کچھ دشوار نہیں

لیکن میرے مانع ہوتے ہیں پیمان و فا فرمان خدا

اے مطرب سحر آفریں — اے طائر جادو نوا
تیرا ترنم دل نشیں — تیرے ترانے جانفزا

پر درد تیری کوک ہے پر اثر تیری صدا

جب تانیں تری سنتا ہوں میں — اک کنج میں بیٹھا ہوا
سنتا ہوں سر دھنتا ہوں میں — اک کیف میں ڈوبا ہوا

اے طائر جادو نوا کیا سحر ہے نغمہ ترا

آواز آتی ہے تری — لیکن نہیں تیرا پتا
لے مجھ کو بھاتی ہے تری — اے مطرب غمگیں نوا

ہے مجھ کو تیری جستجو کس جا ہے تو سچ سچ بتا

اے غائب از اوج نظر — تو کس جگہ مستور ہے
یا تو کہیں آکاس پر — دھرتی سے کوسوں دور ہے

یا تو فقط اک نور ہے جو راگنی میں ڈھل گیا

کیا جسم سے عاری ہے تو — کیا تو محض آواز ہے
خاکی ہے یا ناری ہے تو — ہستی تری کیا راز ہے

. . . .*

کس سے تجھے تشبیہ دیں — آخر بتا اے بے مثال

---

* ٹیپ کے مصرع نہیں ہیں۔

تیری صفت کیونکر کریں دوڑائیں کس کس جا خیال

جیسے کوئی سا نورستی اپنے سجن کی یاد میں
کاٹے جدائی کی گھڑی اک نغمۂ ناشاد میں
اور اس کی خلوت گاہ سے آئے ترنم کی صدا

یا جیسے جوہی کی کلی پتوں کے جھرمٹ میں نہاں
اک خندۂ زیرلبی کے ساتھ ہے نکہت فشاں
اور اس کی نکہت دور تک پہنچا دے رہوار صبا

مجھ کو بتا اے خوش بیاں مضمون اپنے گیت کا
ہے جنگ کی یہ داستاں یا کوئی جھگڑا پیت کا
یا سرگذشت وصل ہے یا درد فرقت کی کتھا

کیا مور سے کرتی ہے تو اپنی محبت کا بیاں
یا آم پر مرتی ہے تو یا تو ہے اس کی مدح خواں
جو ہر جگہ مستور ہے جو ہر جگہ ہے رونما

مجھ کو سکھا دے اے پری یہ سوز یہ طرز فغاں
یہ سحر یہ بے خودگری سن کر جسے سارا جہاں
بیخود ہو یوں جس طرح میں اس وقت ہو کھویا ہوا

قصیدہ

بتقریب جلسۂ وداعی کپتن سی۔ ڈبلیو۔ ایل۔ ہاروے میم سی۔ آئی۔ اے

مرحبا بلبلِ شگفتہ کلام — تیری آواز فصلِ گل کا پیام

دیکھ گذرا غم و الم کا عہد — دیکھ آیا نشاط کا ہنگام

دلربایانہ ہے گلوں کی ادا — اور مستانہ ہے ہوا کا خرام

پھول ہیں رشکِ ساغرِ بلور — بادہ ہے غیرتِ مئے گلفام

ہر طرف ہے نشاط کا عالم — ہیں زمانہ سے گم غم و آلام

بلبلا تو بھی ہو ترنم ریز — ہر طرف ہے نوائے عیش مدام

کیا ہمیں جانتا تو کون ہیں وہ — جن کے دم سے ہے یہ سرور دوام

ہم اراکینِ انجمن کو آج — کس نے بخشی ہے عزتِ اقدام

کس کے جانیکا رنج ہے ہم کو — کس کے رہنے سے تھا ہمیں آرام

جامعِ جملہ وصفہائے جمیل — کیپٹن ہاروے بلند مقام

موجبِ عیش سمع تیرا ذکر — مایۂ ناز نطق تیرا نام

سروِ رعنائے مرغزارِ فرنگ — گلِ زیبائے بوستانِ نظام

خوش بیاں خوشخصال خوش اخلاق — نیک دل نیک ذات نیک کلام

بخشش میں رشکِ گنگ و جمن — عقل و دانش میں مثلِ لچھمن و رام

گیمسن پر آپ کی توجہ خاص — خلق پر آپ کا تلطف عام

چیف ٹنس ہیں بال و الی بال — سب میں ہے تم کو دستگاہ تمام

آپ ہم سے بچھڑ تو رہے ہیں — گرچہ اے صاحب بلند مقام

پر یقیں جانیے گا آپ کی یاد — دل میں باقی رہے گی اپنے مدام

نہ نکالے گا فاصلہ اس کو — نہ مٹائے گی گردش ایام

ہے یہ آخر میں تحسین کی دعا — اے شہنشاہ ذوالجلال و اکرام

جب تلک آفتاب ہو ساکن — جب تلک آسماں ہو گردش کام

جب تلک کل ثوابت و سیار — ہوں گرفتار ایک بند نظام

جب تلک وصل ہو طرب آمیز — جب تلک ہجر ہو پر از آلام

رہیں دلشاد ہارڈے صاحب — شادی و انبساط ہو مادام

یہ سفر آپ کو مبارک ہو — بخت و اقبال ساتھ ہو ہر گام

فیض ہے آپ کا ازل آغاز — عمر ہو آپ کی ابد انجام

دل میں جو کچھ تھا آ گیا لب پر
شاعری سے سروش کو کیا کام

نثر کا ایک نمونہ

نقاد

یا

ابو اللسان محمد عبد الواحد المتخلص بہ جاہل

تنقید ایسا علم ہے جس کی بدولت لوگ ذرا سی کوشش سے گراں قدر اور مہیب بن جاتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے ایجاد و اختراع کی قوت بہت کم لوگوں کو عطا ہوئی ہے اور علوم و فنون کے اکتساب کی مشقت اتنی سخت ہوتی ہے کہ برضا و رغبت برداشت نہیں کیجا سکتی۔ لیکن ہر شخص اپنی عقل کے مطابق دوسرے کے کام پر رائے زنی ضرور کر سکتا ہے۔ پس وہ شخص جس کو قدرت نے کمزور بنایا اور کہالت نے جاہل رہنے دیا "نقاد" کا لقب حاصل کر کے اپنے غرور خود نمائی کو سنبھالے رکھ سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس گروہ کثیر کو جو اپنی زندگی گمنامی میں گزار رہا ہے یہ بات معلوم کر کے کہ نام و نمود کس آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے بڑی تسلی ہوگی بازار ادب کے دوسرے تماشے [illegible] علم سخن اور مصوری ہیں مدتوں ان کی پرستش کرنی پڑتی ہے پھر بھی ان کا حصول یقینی نہیں لیکن تنقید ایسی دیوی ہے جہاں رسائی بہ سہولت اور کامیابی بہ سرعت حاصل ہوتی ہے۔ وہ کاہلوں کی مدد کرتی اور بزدلوں کے دل بڑھاتی ہے۔ جہاں معنی نہ ہو وہاں وہ الفاظ مہیا کر دیتی ہے اور جہاں جوش و خروش نہ ہو وہاں اس کا بدلہ بغض و عناد سے

کرتی ہے۔

اس علم کی ایک خاص خوبی ہے جو اسی سے متعلق ہے۔ اس میں بغیر حقیقی اذیت رسانی کے کینہ و حسد کا اظہار کیا جاتا ہے۔ آج تک کوئی جوہر قابل معترضین کے انفاس زہر آلود سے برباد نہیں ہوا۔ جو زہر بند دیکھے جانے پر دل کے پرخچے اڑا دیتا ہے معنے پھنکاروں میں ہوا ہو جاتا ہے اور عداوت قابلیت کو صدمہ پہونچائے بغیر خاموش ہو جاتی ہے۔ نقاد ہی ایسا شخص ہے جس کی فتحمندی دوسرے کے شکست اور جس کی بزرگی دوسرے کی تباہی پر مبنی نہیں۔

ایک ایسے علم کی تعریف میں جو ایک ساتھ ایسا سہل اور ایسا شہرت پذیر، ایسا خصوصیت سے مملو اور دیسا بے ضرر ہو مزید تمہید کی ضرورت نہیں۔ اس لئے ایک مثال دے کر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اگر چاہیں تو سب نقاد بن سکتے ہیں۔

عبدالواحد ایک خوشحال گھرانے کا واحد چراغ تھا۔ جب اس نے میٹریکولیشن کا امتحان بہ مشکل درجۂ سوم میں کامیاب کر لیا تو باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا اور عبدالواحد پر کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی۔ اس طرح آزاد اور مطلق العنان ہو جانے کے بعد اس نے ٹھان لیا کہ میں ایک ادیب بے نظیر اور عالم بے بدل بنوں گا۔ اپنے اس ارادہ کو پورا کرنے کے خیال سے وہ تھیٹر کے قریب کے ہوٹلوں، مشاعروں اور علمی مباحثوں میں اکثر جاتا اور بڑے غور و توجہ سے ان لوگوں کی باتیں سنتا جو جذبات و محاکات صنائع و بدائع، زبان دانی و مضمون آفرینی کی نسبت کیا کرتے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شعر و شاعری کی نسبت وہ کچھ کچھ سمجھنے لگا اور امید کرنے لگا کہ

کچھ دنوں بعد وہ بھی بحث میں حصہ لے سکیگا۔

لیکن وہ اتنا ناسمجھ نہ تھا کہ تمام و کمال اپنی فطری سمجھداری پر بھروسہ کرتا اور کتابوں کی امداد سے استفادہ نہ کرتا۔ چنانچہ جب دفاتر و مدارس کھل گئے اور شاعروں کی گرم بازاری کم ہوئی تو وہ چند چیدہ مضمون کی چیدہ کتابیں لیکر اپنے مقطعے چلا گیا۔ اور وہاں بہم سعی و کوشش سے ان کے خیالات ذہن نشین کر لئے۔ جب وہ واپس ہوا تو شستہ الفاظ اور چست فقروں میں کہنے لگا کہ شاعری تخیل و محاکات سے وابستہ ہے۔ شاعر کا اولیں مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے زمزمہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوں جو چیز جذبات کو برانگیختہ نہ کرے وہ شعر نہیں ہو سکتی۔

اب عبدالواحد کے راستہ میں دو سخت مشکلیں حائل تھیں جن کو حل کئے بغیر (اس کے خیال میں) وہ کبھی بزم انتقاد کی کرسئ صدارت کا اہل تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے کسی سے سن پایا تھا کہ جو سخنور نہیں وہ سخن سنج بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی۔ کہاں شاعری کی لطیف فضا کہاں اس کی طبیعت کا جمود۔ کہاں شاعری کی آسماں پیمائی کہاں اس کی طبیعت کی زمیں پیوستگی۔ غرض شاعری اور اس کی طبیعت دو متضاد چیزیں تھیں جن کا اجتماع دشوار بلکہ محال تھا۔ عبدالواحد اتنا خود فریب بھی نہ تھا کہ اس بعدالمشرقین کو نہ سمجھتا جو اس کی طبیعت اور شاعری میں حائل تھا۔ اسے دن رات یہی الجھن رہتی تھی کہ کس طرح یہ دقت رفع کیجائے۔ مثل مشہور ہے "جوئندہ یابندہ" آخر ایک دن فلاطون فکر نے اسے یہ نکتہ سمجھایا کہ "شعر کہنا اور بات ہے شاعر بن جانا اور بات" اس میں شک نہیں کہ تم کو شعر سے کوئی مناسبت نہیں لیکن تم شاعر ضرور بن سکتے ہو۔ شاعر بننے

کے لیئے صرف تخلّص کی ضرورت ہے" تخلص کا انتخاب عبدالواحد کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ وہ ایسا تخلص منتخب کرنا چاہتا تھا جس میں ندرت ہو اور جس سے اس کی عقلمندی بھی ظاہر ہو۔ اس کو عقلمندوں کا یہ مقولہ معلوم تھا کہ "بیوقوف اپنے آپ کو عاقل کہتے ہیں، اور عقلمند خود کو بیوقوف سمجھتے ہیں" اس مقولہ کو پیش نظر رکھکر اس نے جاہل تخلص پسند کیا۔ تخلص انوکھا بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ اسکی شان خسروکا بھی خفیہ اظہار کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تسلی کیا کم تھی کہ لوگ تخلص میں ندرت پیدا کرنے کے لئے دیوانہ، نادان، وحشی اور احمق تک بن جاتے ہیں اگر اس بنا پر عبدالواحد اپنے آپ کو جاہل کہے تو کون قباحت ہوئی۔

دوسری دقت جو عبدالواحد کو پیش آئی وہ اس کے نام کے بارے میں تھی۔ اس میں اس بیچارہ کا قصور نہ تھا۔ اگر کسی کو خطاوار ٹھہرا سکتا ہیں تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اس کا نام رکھنے میں بہت تنگ نظری سے کام لیا تھا۔ عبدالواحد ایسا مختصر اور آسانی سے ادا ہونے والا نام تھا کہ ہرگز ایک نقاد کے شایان شان نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ عبدالواحد اس بارے میں ہمیشہ اپنے والدین کی شکایت کیا کرتا تھا۔ اور اگر وہ بیچارے زندہ ہوتے تو عجب نہیں بہوت ان سے لڑ بیٹھتا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ کوئی وجہ نہیں انسان عمر بھر دوسروں کے عطا کردہ نام سے پکارا جائے میرا خیال یہ ہے کہ جس طرح لڑکے کی بسم اللہ روزہ کشائی وغیرہ کی رسمیں ہوا کرتی ہیں اسی طرح ایک رسم نام رکھائی کی بھی ہونی چاہیئے جس میں لڑکا سن شعور کو پہنچنے کے بعد آئندہ کے لئے اپنے واسطے ایک نام منتخب کرے اور یہی اس کا اصلی نام ہو۔ خیر یہ تو آئندہ نسلوں کی اصلاح کی تجویز تھی۔ لیکن

فی الوقت ذاتی دشواری کا علاج کیا جائے۔ یہ مسئلہ بھی ایک عرصہ تک ہمارے نقاد کو پریشان کرتا رہا آخر اس نے سوچ نکالا کہ ایک نیا نام رکھنے سے نو بہت سی دشواریاں ہوں گی۔ بہتر یہ ہے کہ موجودہ نام ہی میں کچھ تبدیلی کر بجائے تجدید نہیں تو ترمیم ہی سہی۔ چنانچہ کچھ الٹ پھیر کے بعد ابو اللسان محمد عبد الواحد نام رکھ لیا گیا۔ یہ بھی ابو اللسان کا زبردست کارنامہ تھا۔ تخلص اور نام کے انتخاب پر اس کو ہمیشہ ناز رہا۔

اس طرح کل پرزوں سے لیس ہونے کے بعد مولانا ابو اللسان نے تمام اردو ادب پر دھاوا بول دیا۔ انھوں نے بڑے بڑے شاعروں کی خصوصیات سے ابتدا کی اور یہ عالمگیر کلیہ قائم کیا کہ ہر ایک کے کلام میں محاسن و معائب دونوں موجود ہیں۔ اس کی رائے تھی کہ میر سوز و گداز کا پتلا ہے لیکن اکثر جگہ اتنی سادگی برتی ہے کہ شاعری باقی نہیں رہی۔ سودا کا اول تو شاعر ہونا ہی مشکوک تھا کیونکہ ہمارے نقاد کے خیال میں شاعر کا کلام اپنے عہد کا آئینہ ہونا چاہیے اور یہ بات سودا کے پاس مفقود ہے علاوہ ازیں اس نے الفاظ کے شان و شکوہ کا اس درجہ خیال رکھا ہے کہ اکثر جگہ معنے کو الفاظ کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ وہ انشا کو مسخرہ سمجھتا تھا۔ اور مصحفی کو ایک پیر نابالغ۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ذوق کو شاعری سے کیا سروکار۔ غزل لکھنی تو وہ جانتے ہی نہیں۔ رہا قصیدہ تو اس میں کمال پیدا کرنا کونسی تعریف کی بات ہے۔ کیونکہ قصیدہ خود ایک فضول سی چیز ہے امانت کے کمال کا وہ قائل تھا اور افسوس کرتا تھا کہ یہ جوہر بے مہری زمانہ کا شکار ہوا اور ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنے آپ کو الفاظ کا پابند بنا لیا ہے لیکن اس پابندی میں بھی قادر الکلامی ظاہر

ہوتی ہے کہ اس کا نظیر نہیں نظر آتا اس موقع پر عبدالواحد امانت کا یہ شعر ضرور پڑھتا ہے

گر کہیں شب کو نظر قاقم و سنجاب آیا ہاتھ مل مل کے سحر ہو گئی کم خواب آیا

غالب اور اقبال کا کلام (شاید اس وجہ سے کہ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہے) ابواللسان پر بہت اثر کرتا تھا۔ اور اکثر اوقات "طلوع اسلام" کے بند یا غالب کی بعض مشکل غزلیں بلند آوازمیں جھوم جھوم کر پڑھا کرتا اس وقت اس کی آنکھوں پر ایسی بے خودی اور کیف کا عالم طاری رہتا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا سے اوپر بہت اوپر عالم بالا کی سیر میں ہے لیکن ان کی نسبت بھی اس کا خیال تھا کہ دونوں اتنی اونچی اوڑان مارتے ہیں کہ خود ہی گم ہو جاتے ہیں اور معنے کے آگے حسن الفاظ کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔

وہ کہا کرتا تھا کہ مثنوی کے میدان کے بس دو ہی سورما ہیں نسیم اور میرحسن جن میں فضیلت کا سہرا یقیناً نسیم کے سر ہے۔ گلزارِ نسیم۔ نازک خیالی۔ مضمون آفرینی اور شاعرانہ تخیل کے لحاظ سے سحرالبیان سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن حالی جیسے سطحی نقاد موخر الذکر کو ترجیح دیتے ہیں علاوہ اور خوبیوں کے گلزار نسیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار میں "دہرے معنے" پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بادشاہ زین الملوک کی نسبت شاعر رقمطراز ہے ؎

حق نے بخشے تھے چار فرزند دانا، عاقل، ذکی، خردمند

دوسرے مصرعہ میں چار لفظ ہیں۔ دانا۔ عاقل۔ ذکی۔ خردمند۔ اور لڑکے بھی چار ہیں۔ چاہیں تو ہم ان کو شہزادوں کے صفات

تصور کریں چاہیں ان کے نام سمجھیں۔
اسیطرح جب چاروں شہزادے گل بکاولی کی تلاش میں نکلتے ہیں تو لکھتا ہے ؎

رخصت کئے شہ نے چار و ناچار | شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
لشکر اسباب خیمہ خرگاہ | شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ

"چار و ناچار" کی رعایت تو صاف ظاہر ہے۔ لیکن بڑی خوبی دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں ہے۔ اس میں بھی چار شہزادوں کے اعتبار سے چار لفظ ہیں۔ لشکر۔ اسباب۔ خیمہ۔ خرگاہ۔ چاہیں تو ہم اس کا یہ مفہوم لے سکتے ہیں کہ سب مل کر گئے اور ہمراہ یہ یہ چیزیں لے گئے۔ یا یہ کہ ہر ایک شہزادے نے اپنے ساتھ ایک ایک چیز لے لی۔ ایک لشکر لے گیا ایک اسباب، ایک خیمے لے گیا اور ایک خرگاہ۔ اس طرح کی سینکڑوں خوبیاں مثنوی گلزارنسیم میں شروع سے آخر تک بھری پڑی ہیں۔ لیکن دیکھتا کون ہے؟
لوگ عام طور پر صلح پسند ہوتے ہیں۔ اس لئے ابو اللسان کی باتیں بلا کسی سخت تردید کے تسلیم کرلی جانے لگیں۔ اور اگر شاذ و نادر کوئی حریف مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑا بھی ہوتا تو عام لوگوں کی آراء اور عبدالواحد کے اثر سے اس کا جلد خاتمہ ہو جاتا۔ اور اس طرح ہر جنگ کے بعد عبدالواحد کے دل میں خود اعتمادی اور خود اعتمادی میں استحکام پیدا ہوتا۔
عبدالواحد ہمیشہ اشعار کی پوشیدہ خوبیوں کا متلاشی رہتا ہے خصوصاً جب اسے ایسا شعر ملتا ہے جس میں آواز خود مفہوم کو ادا کرے یا الفاظ اور معنی میں مناسبت ہو تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ اس نے اکثر شاعروں کے کلام کا مطالعہ اس خاص خوبی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا ہے

اور اسے اس بات کی حیرت ہے کہ ان شاعروں کا مطالعہ کس سرسری طرح ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس شعر میں زلزلہ کی کیفیت محسوس نہیں کی ۔

آثار اذا زلزلت الارض عیاں ہیں
ہستی ہو نہ بستی ہو مکیں ہو نہ مکاں ہو

اور اکبر کے اس عجیب و غریب شعر پر آج تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

کام اتنا چھوٹا اور حضرت کا نام اتنا بڑا
سنتے ہیں اکبر کو ہے عشق دہان تنگ بت

مولانا ابو اللسان کے خیال میں اس ایک شعر میں ہم آہنگی مضمون والفاظ کی دو خاص مثالیں ملتی ہیں یہ ناممکن ہے کہ ہم ان دو مصرعوں کو شگفتگی کے ساتھ پڑھیں۔ اور اس قسم کا عمل نہ کریں جس کا بیان شعر میں کیا گیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں لفظ بت ادا کرتے وقت خود ہمارا منہ تنگ ہو جاتا ہے اور لفظ بت کس آسانی سے ہمارے ہونٹوں سے پھسل پڑتا ہے گویا یہ نہایت چھوٹا کام ہے۔ دوسرے مصرعہ سے ایک شکوہ تمکنت ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصاً جب ہم حضرت کا نام اتنا بڑا کہتے ہیں تو ہمارا منہ کھل جاتا ہے اور تھوڑی دیر تک کھلا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ منہ کھل جانا یا منہ کھلا کا کھلا رہنا کے معنے کسی کی بزرگی سے مرعوب ہونے کے ہیں اور اس مصرعہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ اکبر کی عظمت جتائے ان تمام خوبیوں کو اکبر نے کس کمال سے ایک شعر میں یکجا کر دیا ہے لیکن ظاہر ہیں اشخاص کو چھوٹا اور بڑا میں تضاد اور بڑا اور اکبر میں مناسبت لفظی نظر آتی ہے۔ افسوس کہ باوجود ان تمام خوبیوں کے یہ الماس بھی عام سنگریزوں میں پڑا تھا اگر عبدالواحد کی ذہانت کام نہ کرتی تو معلوم نہیں یہ ان سے علیحدہ کیا بھی جاتا یا نہیں۔

اب ابو اللسان آسمان ناموری کے سمت الراس پر پہنچ گیا تھا۔

جب وہ کسی مشاعرے میں جاتا تو ہر ایک کی آنکھیں اس پر جمی رہتیں جب وہ کسی علمی مجلس میں شریک ہوتا تو نوخیز شاعر اور ناتجربہ کار مضمون نگار اس کے گرد حلقہ کئے رہتے جن کی کوئی رائے نہ تھی وہ اس سے رائے طلب کرتے جن کو تجربہ نہ تھا وہ اس کے تجربہ سے مستفید ہونا چاہتے۔ غرض ہر ضرورتمند اپنی تشنگی مٹانے کے لئے اس چشمۂ علم و ادب کا رخ کرتا اور اس قسم کے اکثر اشخاص کا خیال تھا کہ کوئی تصنیف کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ابواللسان اس پر صاد نہ کرے۔

قدیم شاعری کے روندے ہوئے جنگل سے نکل جب ہمارے نقاد کا سمندِ خیال جدید شاعری کے ہموار میدان میں آتا تو ایسی کلیلیں بھرتا کہ اکثر اوقات بے لگام نکل جاتا۔ موجودہ شاعروں کی نسبت اس نے بہ تخصیص نام بہ نام خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا پردۂ خفا میں رہنا ہی مناسب ہے۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میاں ابواللسان کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ لیکن عام شاعری کی نسبت ان کے خیالات کی ندرت و جولانی ضرور قابل ملاحظہ ہے۔

سب سے پہلے اس کا خیال ہے کہ موجودہ شاعری میں سادگی کا بہت لحاظ رکھا جانے لگا ہے۔ بجز ایک دو شعرا کے اکثر کا کلام اتنا سادہ ہے کہ پڑھنے سے جی اکتا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سادگی کلام نہایت اچھی شئے ہے چنانچہ قدما کا مطمح نظر بھی یہی تھا لیکن اس پر بہت زیادہ عمل کرنے سے شاعری باقی نہیں رہتی اور اکثر شعرا اس وضع کے ہو جاتے ہیں ؎

فلک نیلا ہے اور سبزہ ہرا ہے ہوا ٹھنڈی ہے پانی بہ رہا ہے

اس لئے مناسب ہے کہ موجودہ شاعر اشعار کو پیچیدہ اور مشکل بنانے کی کوشش کریں۔

بعض مرتبہ وہ اردو شاعری کی موجودہ حالت دیکھکر حسرت و یاس میں ڈوب جاتا ہے اور بعض دفعہ اس کے ایک شاندار مستقبل کی امید میں اس کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگتا۔

کبھی وہ ردیف و قافیہ کی قیود کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگتا اور کہتا کہ انسان فطرتاً تنوع پسند ہے۔ ایسی صورت میں ایک با مذاق شخص اس بات سے کیسے خوش ہو سکتا ہے کہ ایک مصرعہ کا آخری لفظ وہی ہو جو دوسرے کا ہے۔ وہ افسوس کرتا کہ کس قدر بیرحمی کے ساتھ مرغ معنے کو بحر و قافیہ کے پنجرے میں قید کرنے کی کوشش کیجاتی ہے اور اگر مضمون وسیع ہو تو کس بری طرح اس کے بال و پر کترنے پڑتے ہیں۔ اس لئے میں اپنے نوجوان شاعر بھائیوں کو نصیحت کروں گا کہ نظم معرا میں طبع آزمائی کریں۔ اظہار خیال کی یہ بہترین شکل ہے البتہ اس میں ایک سخت دقت یہ ہے کہ اس صورت میں نظم و نثر میں امتیاز مشکل ہو جائے گا۔ (یہاں یہ امر ناظرین سے پوشیدہ نہ رہے کہ ابواللسان ردیف و قافیہ ہی سے شعر کو شعر سمجھتے ہیں)۔

ابواللسان کی خوشی کی انتہا نہ رہتی جب کوئی ہونہار شاعر اصلاح مشورے کے لئے اس کے پاس آتا اس وقت وہ بہت سنجیدہ ہو جاتا اس کے ایک ایک حرف ایک ایک حرکت سے شان عظمت ٹپکی پڑتی، اس کی آنکھوں سے فراست ٹپکنے لگتی اور پیشانی پر تفکر کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے اس وقت وہ آہستہ آہستہ دبی مگر گہری آواز میں اس کو ہدایات

دینے لگتا۔ اس کے الفاظ نہایت برجستہ اور اس کے جملے بالکل نپے تلے ہوتے۔ طلب سے پہلے وہ مشورہ طلب نوجوان کو نصیحت کرتا کہ اولاً ایک اچھے شاعر کو اپنا نصب العین بنانا چاہیئے۔ اور زمانہ موجودہ کے حالات کا لحاظ کرتے اقبال کا تتبع نہایت مفید اور مناسب معلوم ہوتا ہے اقبال کی تقلید کی بڑی خوبی یہ ہے کہ تعریف و تحسین کی رجسٹری ہو جاتی ہے شعر اچھا ہوا تو واہ واہ اور نہ ہوا تو واہ واہ کیونکہ لوگ الفاظ کے شکوہ و تجمل سے متاثر ہو کر تعریف کر ہی دیتے ہیں۔

عبدالواحد کی وعظ و نصیحت کا اثر بہت ہی امید افزا ہونے لگا نوخیز اور اولوالعزم نوجوان اقبال کے رنگ میں نہایت کامیاب اشعار لکھنے اور مولانا ابواللسان کو سانے۔ مولانا جی کھول کر ان کی تعریفیں کرتے اور ان کا دل بڑھاتے۔ ایک دن جب ایک نوجوان شاعر نے یہ شعر پڑھا۔

ترنم ریز بلبل کی نوائے شہریاری ہے ۔۔۔ صبا آوارہ لیکن حال مشک تتاری ہے
فروغ شعلۂ تعمیر سے ہی ہم نفس دنیا ۔۔۔ ہجوم یاس بھی ہنگامۂ باد بہاری ہے

تو مولانا ابواللسان لوٹ گئے۔ واہ واہ سبحان اللہ کے نعرے لگانے لگے۔ کئی دفعہ پڑھوا کر سنا۔ اور پھر خود بھی جھوم جھوم کر اس مصرعہ کو دہرانے لگے۔

ہجوم یاس بھی ہنگامۂ باد بہاری ہے

نوجوان نے جب تعریف و تحسین کا یہ طوفان دیکھا تو گزبھر کا سینہ ہو گیا۔ خوشی کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ مصرعوں کے الفاظ گاؤ کیہ بو کر

رہجاتے تھے۔ خیر جوں توں غزل ختم کی۔ مولانا ہر شعر پر دادِ سخن دیتے رہے اور لڑکے کے مسرت سے دانت نکلے پڑتے تھے۔ غرض بڑی دیر تک یہ سخن سرائی اور سخن سنائی کا ہنگامہ قائم رہا۔ آخر کار نوجوان اجازت لیکر رخصت ہوا۔ اس پر ایک سرور کا عالم طاری تھا۔ وہ دل ہی دل میں مزے لے لے کر اپنے اشعار دہرا رہا تھا وہ اس کو کبھی اتنے اچھے نہیں معلوم ہوئے تھے جیسے اس وقت معلوم ہوتے تھے۔ مولانا کا کیف سے کے عالم میں جھومنا اور واہ واہ کی آوازیں لگانا اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ مولانا ایک نہایت غیر معمولی قابلیت کے شخص ہیں۔ راستہ میں جو ملاقاتی ملتے وہ ان کے آگے مولانا کے علم و تبحر کی تعریفیں کرتا اور خوش اخلاقی و سخن سنجی کے گیت گاتا۔ اس طرح مولانا کی شہرت و ناموری میں اضافہ ہوتا دوسرے طالب علم ان کے پاس مشورہ کے لئے آتے اور مولانا کے اخلاق واوصاف کے گرویدہ ہو جاتے۔

یونہیں ہر روز کمسن ناتجربہ کار نوجوان مولانا کے پاس آتے ہیں اور ان کو اپنا جدید کلام سناتے ہیں۔ مولانا ان کے دل بڑھاتے ہیں اور اپنی شہرت بھی۔

ہماری بھی خدا سے دعا ہے کہ مولانا کی شہرت میں اور اضافہ ہو اور ان کے سایہ میں یہ نوجوان پھولیں پھلیں۔

جیتے رہیں گرو جی زندہ رہیں یہ بھولے (اکبر)

ماخوذ از جاسن
ابوالنصر فتح اللہ

ڈراما

برادر مرحوم جب اسکول فائنل میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شیکسپیر کا مشہور ڈراما "اے مڈسمر نائٹس ڈریم (   )" ان کے کورس میں تھا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اس کا ترجمہ اپنے اسٹائل پر کرنا شروع کیا تھا۔ اوقات فرصت میں تھوڑا تھوڑا لکھتے رہتے۔ امتحان ایچ۔ سی۔ ایس سے فراغت حاصل کرکے اس کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ اور ارادہ تھا کہ کچھ ردو بدل و ترمیم کے بعد اس کو شائع کر دیں۔ ایک مختصر سی تمہید بھی لکھی تھی جس کا ناتمام مسودہ مجھے ان کے کاغذات میں ملا۔ لیکن افسوس صد ہزار افسوس کہ ظالم موت نے ان کے کسی ارادہ کو صورت عمل نہ اختیار کرنے دی۔ ؎

نکلی تو ایک بھی نہ دل کی ... دل میں حسرت ہی رہ گئی دل کی

ان کے انتقال کے بعد میں نے ان کے تمام مسودات نظم و نثر جمع کئے اور انھیں دیکھ دیکھ کر اپنا غم بھلاتا۔ اکثر احباب بھی آکر شریک ہوتے۔ جملہ نحوکلام سے محظوظ ہو کر مرحوم کی یاد کو اس طرح تازہ کرتے رہتے۔ اب چند روز سے ڈراما کا ترجمہ جو تقریباً مکمل حالت میں تھا، مجموعہ مسودات سے گم ہے۔ ایک ایک کاغذ اور ایک ایک پرزہ ڈھونڈ ڈالا۔

ایک ایک دوست سے دریافت کیا مگر اس کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ مرحوم کی تمام زندگی کا یہ پہلا ادبی کارنامہ تھا جو افسوس ہے کہ اس طرح تلف ہو گیا۔ یہ وہ ناقابل تلافی نقصان ہے جس کا احساس تمام عمر رہے گا۔

جدید تلاش اور جستجو میں ایک اور پرچہ اسی ترجمہ کا ہاتھ لگا اول تو یہ بالکل کم ہے۔ دوسرے ناقص۔ کیونکہ انھوں نے اس میں بہت کچھ حک و اصلاح کی تھی۔ ناموں میں تبدل کیا گیا تھا۔ الفاظ فقرات۔ اور عبارت بدلی تھی۔ با ایں ہمہ دل نہیں گوارا کرتا کہ مرحوم کی مدت کی دماغ سوزی بالکل ہی معدوم کر دی جائے لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ موجودہ ناقص و نامکمل حصۂ ترجمہ ہی کو بطور نمونہ شائع کر دیا جائے۔

تلاش و تفتیش ہنوز جاری ہے۔ اگر گم شدہ ترجمہ دستیاب ہو جائے تو انشاء اللہ متعاقب اس کی اشاعت کی جائیگی۔

ابو ظفر

تمہید

ہر چند ارادہ تھا کہ اپنی پہلی ادبی کوشش بغیر کسی تمہید کے ناظرین کے روبرو پیش کروں لیکن بعض باتیں نکل ہی آئیں جن کا اظہار ضروری تھا۔

اے مڈسمر نائٹس ڈریم شیکسپیئر کے دیگر ابتدائی ڈراموں کی طرح ایک طربیہ ڈرامہ ہے۔ یونان کا مشہور شہر ایتھنز اس کا سین ہے اور قصہ

زمانہ قبل مسیح کا ہے۔ لیکن ڈرامہ کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔ اگرچہ ڈیوک تھیلسیس اور اس کی محبوبہ ہپالیٹا کی شخصیتیں (جن کا ڈرامہ میں کافی حصہ ہے) تاریخی ہیں لیکن پلاٹ ان کے کسی تاریخی کارنامے سے متعلق نہیں۔ لہذا بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہرگز تاریخی قصہ نہیں ہے۔ بلکہ عشق و محبت کی ایک سیدھی سادھی داستان ہے جس میں بظاہر ڈرامہ نویس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس مشہور مقولہ سے "محبت کی راہ کبھی سیدھی نہیں گئی" کی صراحت کرے۔ اور ڈرامہ کے بعض اشخاص کو مفت کی پریشانیوں اور پیچیدگیوں میں مبتلا کرکے سامعین کو محظوظ کرے۔ اس کیفیت کو اور تیز کرنے کے لئے قابل ڈرامہ نویس نے پریوں کو بھی قصہ میں شامل کر لیا ہے۔ اس چاشنی سے ڈرامہ کا رنگ اور چوکھا ہو گیا اور اس پر طرہ یہ کہ مذاقیہ حصہ (کامک) سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے۔ غرض مختلف ترکیبوں سے شیکسپیر نے سامعین کے لئے ہنسی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنے کا مقصد تو یہی ہونا چاہیئے کہ ترجمہ پڑھنے کے بعد ناظرین پر کم و بیش وہی کیفیت طاری ہو جو اصلی ڈرامہ کے دیکھنے سے طاری ہوتی ہے لیکن اس میں بڑی دقت تھی۔

اردو اور خاص کر ناٹک کی اردو یونانی ناموں کے بارگراں کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ ڈرامہ اور خصوصاً طربیہ ڈرامہ کی زبان سلیس اور سبک ہونی چاہیئے ثقیل اور بھدے الفاظ کی کثرت سے ڈرامہ کی خوبی زائل ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں بڑے بڑے غیر مانوس یونانی ناموں کی وجہ سے ناممکن تھا کہ ترجمہ میں وہ بات پیدا ہو سکے جس کی ضرورت ہے۔ ناموں کی تبدیلی سے قصہ میں صرف اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ جشن (ڈیوک تھیلسیس کے عہد میں بمقام ایتھنز ہو ایک خیالی بادشاہ کے زمانہ میں ایک

ایک خیالی شہر میں واقع ہوتا ہے۔

چونکہ مافوق العادت امور اور پریوں اور پریزادوں کا تعلق قصہ سے ہے۔ اس تبدیلی سے نفس ڈرامہ غیر متاثر رہتا ہے۔

ترجمہ کرنے میں نہ تو بالکل آزادی برتی گئی اور نہ بالکل اصل کی پابندی ملحوظ رہی ہے البتہ شروع سے آخر تک مطمح نظر یہی رہا کہ کہنے والے کے جذبات پوری طرح ادا کر دئے جائیں۔ اس ڈرامہ میں یونانی دیوتاؤں کی طرف جہاں جہاں تلمیح کی گئی ہے۔ ترجمہ میں یا تو ان کو بالکل چھوڑ دیا گیا یا جہاں ممکن ہوا ہندی صنمیات سے مماثل دیوتاؤں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ایکٹ پہلا

پہلا سین — فرخ کا محل

(فرخ، مہر نگار، شوکت، امرا اور خدمتگار داخل ہوتے ہیں۔)

فرخ۔ پری جمال ملکہ۔ ہماری شادی کا وقت چلا آ رہا ہے۔ شادمانی کے چار دن گزر جانے کے بعد نیا چاند جلوہ آرا ہوگا۔ مگر آہ یہ چاند بھی کتنی سستی سے گھٹ رہا ہے۔ ارے ظالم تو میری آرزوؤں کو پامال کئے ڈالتا ہے۔ ہائے۔ اب دل میں انتظار کی طاقت نہیں رہی۔

مہر نگار۔
چار دن چھپ جائینگے جا کر اندھیری راتیں | چار راتیں نیند میں ہو جائینگی خواب خیال
پھر تو ماہ نو مثال قاصد فرخندہ پا | عاشقوں کیواسطے لائیگا پیغام وصال

فرخ۔ شوکت، جا، جوانان شہر کو جشن شادی کے لئے تیار کر، مسرت کی لطیف و نازک روح کو بیدار کر، رنج و ماتم کو میرے شہر سے دور کر دے۔ سارے جہاں کو بادۂ عشرت سے مسرور کر دے (شوکت جاتا ہے) مہر نگار بیشک تو نے میری الفت میں آفتیں جھیلیں۔ مصیبتیں برداشت کیں۔ سلطنت کو چھوڑا وطن سے منہ موڑا مگر اب ہماری شادی کچھ اور ہی رنگ سے ہوگی، عیش و مسرت کے شادیانے بجیں گے جشن و شادی کے جلسے جمیں گے (منظور

[illegible]

منظور۔ شاہ فرخ تو سدا خرم و دلشاد رہے   تیرا دربار سلامت رہے آباد رہے

فرخ۔ اچھے منظور کیا حال ہے۔

منظور۔ کیا عرض کروں زندگی وبال ہے۔ مضطرب ہو کر حضور کے دربار میں آیا ہوں اپنی بیٹی لیلےٰ کی شکایت لایا ہوں۔ محمود سامنے آؤ۔ جہاں پناہ لیلیٰ سے شادی کرنے میں اس شخص کو میری رضامندی حاصل ہے۔ اقبال آگے بڑھ اور حضور اس نے میری لڑکی کو دیوانہ کر دیا۔

تو نے ہاں اقبال تو نے اسکو مفتون کر لیا   نغمۂ الفت سنا کر جھوٹے سوز و ساز سے
ایسی نظمیں لکھ کے بھیجیں اسکو جو معمور تھیں   عشق کی بے تابیوں سے حسن کے اعجاز سے
اسکی کھڑکی کے تلے تو نے شب مہتاب میں   درد کی غزلیں پڑھی ہیں سوز کی آواز سے
دستیاں، گلدستے، زیور، چوڑیاں، انگوٹھیاں   تحفتہً اسکو دیئے تو نے چھپ کر راز سے
اور مری بھولی مری نادان کا دل لے لیا   اس فریب و مکر سے اس بس بھرے انداز سے
تیری ہی عیاریوں سے ہو گئی وہ منحرف   میری طاعت سے مری وقعت مرے اعزاز سے

اور عالیجاہ اگر وہ اس وقت آپ کے حضور میں محمود سے شادی کرنے سے انکار کرے تو میں ہمارے قدیم قانون کے نفاذ کا حق مانگتا ہوں۔ چونکہ وہ میری ہے میں جسے چاہوں اسے دیڈالوں۔ پس وہ یا تو محمود کی ہو رہے یا ہمارے قانون کے مطابق دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

فرخ۔ کیوں لیلیٰ، اسکے جواب میں تم کیا کہتی ہو؟ بی بی ذرا سمجھ سے کام لو۔

باپ کو اپنے تم خدا سمجھو   اس کی ہر بات کو بجا سمجھو
اس کو تم اپنا ناخدا سمجھو   اس کو تم اپنا رہنما سمجھو
وہ غلط بھی کہے تو سچ مانو   ناروا کو بھی تم روا سمجھو
حکم اس کا اٹل خیال کرو   حکم سے سرکشی خطا سمجھو

مرتبہ میں بہت بڑا ہے باپ
حق میں اولاد کے خدا ہے باپ

اور میرے خیال میں ان کی پسند بھی بری نہیں۔ محمود نہایت قابل شخص ہے۔

لیلیٰ۔ اقبال بھی ایسا ہی ہے۔

فرخ۔ اپنی جگہ وہ بھی ہے۔ لیکن چونکہ تمہارے والد اسے ناپسند کرتے ہیں اس لئے محمود کو ترجیح دینی چاہیئے۔

لیلیٰ۔ کاش ابّا جان میری آنکھوں سے دیکھتے۔

فرخ۔ نہیں تمہاری آنکھوں کو ان کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

لیلیٰ۔ میں حضور سے معافی چاہتی ہوں۔ خدا جانے کس طاقت نے مجھے دلیر بنا دیا ہے کہ حضور کے روبرو اس بیباکی سے اپنے خیالات کے اظہار کی جراءت کرتی ہوں لیکن حضور سے میری التجا ہے کہ مجھے یہ بتا دیا جائے کہ اگر میں محمود سے شادی کرنے سے انکار کردوں تو کس بُرے سے بُرے انجام کو پہونچوں گی۔

فرخ۔ سزائے موت، یا ہمیشہ کے لئے انسانی صحبتیں ترک کرنے کا عہد۔ اس لئے لیلیٰ پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اپنی تمناؤں، آرزوؤں کو کسو، ارمانوں امنگوں کو جانچو، عالم شباب پر نظر ڈالو۔ فطرت کے تقاضوں کو دیکھو بھالو۔ اگر تم اپنے والد کی مرضی پر کاربند نہیں ہوتیں تو کیا خانقاہ کی زندگی برداشت کرسکتی ہو۔ رات دن تاریک و تیرہ چار دیواری میں قید رہکر کیا تم اپنی کنواری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار سکتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ اس طرح اپنے فطری ولولوں پر قابو پاکر زندگی کا سفر ختم کردیتے ہیں بہت پاک سرشت ہیں،

لیکن دنیوی مسرتوں کو پیش نظر رکھکر میں یہ کہوں گا ؎

وہ شگفتہ پھول جس کی روح سے خوشبو بنے
یا جو گل پیراہنوں کی زینت گیسو بنے

ناتمام